معارف

دسمبر ۲۰۱۵ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے
دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے
ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

(اوپر کی رقوم ہندوستانی روپئے میں دی گئی ہیں)

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

سجاد الٰہی صاحب، 27-A لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور (پاکستان)

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- مآخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جزا ور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۶ ماہ ربیع الاول ۱۴۳۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۱۵ء عدد ۶

فہرست مضامین

(مرتبہ)

اشتیاق احمد ظلی

محمد عمیر الصدیق ندوی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

پیرس سانحہ کے نتیجہ میں شام اوراس کے آس پاس کا خطہ اس وقت جن حالات کا شکار ہے اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ بشارالاسد، داعش، النصرۃ، کرد، ترکمان اور الحزب الحر کے درمیان بٹے ہوئے اس ملک کے بدنصیب باشندے ایک طرف تو ان متحارب گروہوں کی زد میں ہیں، دوسری طرف آسمان سے ان کے اوپر مسلسل آگ برستی رہتی ہے۔ شام کے فضائی حدود اس وقت دنیا بھر کے سب سے زیادہ خطرناک اور مہیب جنگی طیاروں کی آماج گاہ ہیں۔ جس ملک کے اندر بھی شامی سرحدوں تک پہنچنے کی قوت اور صلاحیت ہے وہ اس مہم جوئی میں اپنا حصہ ادا کررہا ہے۔ انتہا پسندوں نے تو شاید اپنی حفاظت کا کچھ نہ کچھ بندوبست کر رکھا ہو لیکن وہاں کے عام باشندوں کے لیے کوئی جائے امان نہیں اور آسمان سے مسلسل برستی ہوئی موت سے نجات کی کوئی سبیل نہیں۔ چند گمراہ لوگوں کی بداعمالیوں کا بدلہ لینے کے لیے پورے خطے کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر جن لوگوں کے ہاتھ میں طاقت ہے ان کے تصور انصاف کا یہی تقاضا ہے۔ داعش کو کن لوگوں نے اور کن مقاصد سے تخلیق کیا، اس کو جدید ترین ہتھیار کہاں سے ملے اور ان کو مالی وسائل کہاں سے فراہم ہوتے ہیں یہ اب کوئی سربستہ راز نہیں رہ گیا ہے۔ داعش اس مشترکہ یورش سے جاں بر ہوسکے گی یا نہیں یہ تو مستقبل ہی بتائے گا البتہ اتنا یقینی ہے کہ وہ خطہ اس سے جاں بر نہیں ہوسکے گا۔ یہاں کے لاکھوں باشندے دنیا کے دور دراز گوشوں میں پناہ کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں اور جن کے ہاتھوں اس انجام تک پہنچے ہیں انہی کے دروازے پر رحم کی بھیک مانگنے کے لیے مجبور ہیں۔ جو پیچھے رہ گئے ہیں وہ اپنی جان سے اس کی قیمت چکا رہے ہیں۔ اس پورے انسانی المیہ کا سب سے حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ دنیا کے یہ طاقت ور اور عقل مند ملک تجربہ سے کوئی سبق نہیں سیکھ سکے۔ ان کی سمجھ میں اتنی معمولی سی بات نہیں آتی جو عام انسان کو دیوار پر لکھی صاف نظر آرہی ہے۔ ان کے پالیسی سازوں اور بڑے بڑے تھنک ٹینک اس حقیقت کے ادراک سے قاصر ہیں کہ جب تک ان اسباب وعوامل کا پتہ نہیں لگا لیا جاتا جو اس صورت حال کے لیے ذمہ دار ہیں اور ان کے تدارک کے لیے موثر تدابیر نہیں اختیار کی جاتیں، اس وقت تک اس پر قابو پانے کی خواہش ایک خواب پریشاں سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس وقت

جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کا علاج نہیں ہے بلکہ اس سے حالات کے مزید بگڑنے کا امکان زیادہ ہے۔ اسے دراصل ملیشیا کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر مہاتیر محمد کے بقول Out - terrorising the terrorist کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی موجودہ صورت میں یہ ٹیررازم کی بدترین شکل ہے۔ اس مہم میں طاقت کے ضروری اور مناسب استعمال کے ساتھ ساتھ جب تک دلوں کو جیتنے کی کوشش نہیں ہوگی اس وقت تک اس کی کامیابی کی توقع عبث ہے۔ جب تک ناانصافی اور محرومی کے احساس کا مداوا نہیں کیا جاتا اس وقت تک اس کا حل ممکن نہیں ہے۔ اگر اپنی تمام تر طاقت اور ہیبت کے باوجود ''آپریشن شاک اینڈ آ'' اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تو اس نئی مہم سے بھی اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس مہم میں کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ شام کا مسئلہ حق وانصاف کے تقاضوں کے مطابق حل کیا جائے اور وہاں کے مظلوم باشندوں کو بشارالاسد کے پنجہ استبداد سے نجات دلائی جائے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فلسطین کا مسئلہ حل کیا جائے جو ان تمام مسائل کی جڑ اور بنیاد ہے اور انہی طاقتوں کا پیدا کیا ہوا ہے اور انہی کے سہارے اسرائیل کا ناجائز وجود قائم ہے۔ اگر محض طاقت کے استعمال سے مسائل کا حل ممکن ہوتا تو گذشتہ چند برسوں میں جس قدر طاقت کا استعمال کیا گیا ہے اس کے پیش نظر اب تک روئے زمین کے تمام مسائل حل ہو چکے ہوتے۔ غیر معمولی طاقت کا استعمال، لاکھوں انسانی جانوں کے اتلاف اور ناقابل بیان وسائل اور املاک کی بربادی کے باوجود یہ خطہ پہلے سے کہیں زیادہ غیر مستحکم اور غیر محفوظ ہو چکا ہے اور بارود کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جو بات طالبان سے شروع ہوئی تھی وہ اب داعش تک پہنچ چکی۔ اگر بنیادی اسباب وعوامل کو سمجھنے اور ان کے پائدار حل تلاش کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ اس نئی یورش کے بطن سے کوئی اور بھی زیادہ خطرناک عفریت نہ جنم لے لے اور دنیا مزید غیر محفوظ ہو جائے۔

۸/نومبر کو برما میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ اس میں حزب اختلاف ''نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی'' (NLD) نے آنگ سان سوکی کی قیادت میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اس باران کو حکومت سازی کا موقع مل جائے اور ۱۹۶۲ء سے قائم فوجی اقتدار کی جگہ سویلین حکومت کا قیام عمل میں آجائے۔ ہمارے لیے ان انتخابات میں دلچسپی کا اصل پہلو یہ ہے

کہ اس کے نتیجہ میں برما کے مسلمانوں پر اور خاص طور سے روہنگیا مسلمانوں پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ ان انتخابات میں ساڑھے چھ لاکھ روہنگیا مسلمانوں کو حق رائے دہی سے محروم کردیا گیا۔ البتہ جن مسلمانوں کو یہ حق حاصل تھا انہوں نے اجتماعی طور پر آنگ سان سوکی کی پارٹی کو ووٹ دیا۔ حالانکہ خود اس پارٹی نے ایک مسلمان امیدوار بھی کھڑا نہیں کیا۔ ۶۰۷۴ امیدواروں نے الیکشن میں قسمت آزمائی کی۔ ان میں صرف ۲۸ مسلمان تھے۔ ملک کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک مسلمان بھی پارلیمنٹ کے لیے منتخب نہیں ہوا۔ برما میں جمہوریت کے مستقبل کے لیے یہ یقیناً نیک فال نہیں ہے۔ اس کے باوجود برما کے مسلمان یہ امید کرتے ہیں کہ آنگ سان سوکی کے اقتدار میں آنے سے حالات بہتر ہوں گے۔ لیکن بظاہر ابھی تک تو ایسے آثار نظر نہیں آتے جن سے ان توقعات کو تقویت پہنچے۔ گذشتہ چند برسوں میں روہنگیا مسلمان جس مسلسل عذاب سے گذرے ہیں الفاظ کے ذریعہ اس کی تصویر کشی مشکل ہے۔ اس کے باوجود آنگ سان سوکی نے آج تک اس کی مذمت اور مخالفت میں کوئی بیان تک جاری نہیں کیا اور نہ ہی ان کی طرف سے الیکشن جیتنے کے بعد بھی مسلمانوں کو انصاف دلانے کی کوئی یقین دہانی کرائی گئی ہے۔ اگر انہوں نے حصول اقتدار کے لیے مصلحت کوشی کا یہ راستہ اختیار کیا تھا تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ حصول اقتدار کے بعد اس کی بقا کے لیے مصلحت کوشی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ بودھوں کی انتہا پسند تنظیم Association for the Protection of the Race at Religion جسے مقامی زبان میں Ma Ba Tha کہتے ہیں اور جو برما میں مسلمانوں کے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، نے راخین کی مقامی اسمبلی میں اکثریت حاصل کرلی ہے۔ یہی روہنگیا مسلمانوں کا بھی علاقہ ہے۔ ظاہر ہے اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ ان انتخابات کو جس میں آبادی کے ایک معتد بہ حصہ کو رائے دہی کا حق بھی حاصل نہیں تھا، مغربی دنیا شفاف اور کامیاب الیکشن قرار دے رہی ہے اور اسے جمہوریت کی فتح سے تعبیر کررہی ہے۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ اس وقت ان کی نظر برما میں بڑی مقدار میں دریافت ہونے والے پٹرول، قدرتی گیس اور معدنیات کے ذخائر پر مرکوز ہے۔ خواہ مخواہ کے جھگڑوں میں پڑنے کی ان کو بھلا کیا ضرورت ہے۔

مقالات

تہذیب قوم نوحؑ

جناب محمد طارق غازی

(۲)

علم نافع کی علامتیں: حضرت نوحؑ کا اتباع کرنے والوں میں یہ خوبی نہیں تھی۔ ان کے پاس بہت مال و زر نہ تھا اور اس سے بھی زیادہ وہ "صناعات میں خسیس" تھے (امام اندلسی۔ بحر المحیط ۵:۲۱۵)۔ یہ کوئی کلیہ نہیں کہ معاشرہ کا کمزور طبقہ بے علم بھی ہو۔ حضرت نوح کے متبعین کا نفع بخش علمی اور فنی مقام تو آگے تعمیر سفینہ کے بیان میں سامنے آئے گا، لیکن جب قوم کے چودھریوں کو دین اور عمرانی فضیلت کا درس دیا جارہا تھا وہ اس علم کے اظہار کا موقع نہیں تھا۔ ان کو خبر تھی کہ قوم کی ثروت مندی اس کے ایک چھوٹے سے طبقہ میں محدود تھی جس کے لیے باقی تمام قوم اراذلنا کے درجہ میں آتی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ صنعتوں کا پھیلاؤ تکثیر مال کا ذریعہ ہوتا ہے اور وہ اضافی مال سرداروں کی تجوریوں میں پہنچ جاتا ہے کیونکہ انہی کی سرمایہ کاری سے صنعتیں پھلتی، پھولتی اور پھیلتی ہیں۔ چنانچہ ایسے معاشروں میں انہی لوگوں کی مانگ اور قدر ہوتی ہے جو صناعات میں ایجادی استعداد کا مظاہرہ کریں یا ایسے افراد کے مددگار اور آلۂ کار بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں جو مال کو ایک جنس بازار بنا کر اسے سرمایہ داروں کے خزانوں تک پہنچاتے رہیں۔ مومنین نوح اس میدان میں بھی بے فیض تھے۔ نہ وہ صنعتکاری میں کوئی مقام رکھتے تھے اور نہ صنعتوں کو وسعت دینے کے قابل اہل مال تھے نہ ان کے اشتہاری بننا چاہتے تھے۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے علم تھے۔ مشرکین نے انہیں ایسا طعنہ نہیں دیا تھا، بلکہ اپنے مالی مفادات کے معاملہ میں انہیں بے فیض اور رذیل کہا تھا۔

ڈائرکٹر امم اسٹڈیز ہاؤس (USH) ٹورانٹو، کینیڈا۔

حضرت نوحؑ جانتے تھے کہ اپنی دولت مندی کے اعلان سے قوم میں ان کی کیا آؤ بھگت ہوگی۔ حضرت نوحؑ کے وسائل کا قصہ تو آگے آئے گا لیکن جب سرداروں نے طعنہ دیا کہ وَمَا نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ (ھود ۱۱:۲۷) اور ہم نہیں دیکھتے کہ تم کو ہم پر کوئی برتری حاصل ہے اور بقول ابن کثیر (ر: تفسیر ۱۲:۵۹۵) قوم نے استدلال کیا کہ اس نئے دین نے تمہیں کوئی مالی فائدہ بھی نہیں پہنچایا کہ تم خوش حال ہو گئے، تمہاری روزیاں بڑھ گئی ہوں، یا خَلق وخُلق میں تمہیں کوئی برتری ہم پر حاصل ہوگئی ہو تو حضرت نوحؑ نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ عزت کی دلیل کثرت مال نہیں ہوتی۔ تمام تہذیبوں کی داستانوں میں یہی ایک کہانی سننے کو ملتی ہے کہ آمدنی اور خوش حالی کا آسان نسخہ تجارت میں فریب دینا ہے۔ بہت بعد میں حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو تنبیہ کی کہ لوگوں کا حق نہ مارو، ڈر ہے کہیں تم پر بھی وہ آفت نہ آئے جو قوم نوح پر آئی تھی (ھود ۱۱: ۸۴-۸۹)۔ قوم فرعون کو بھی ایک قبطی مومن نے اسی سے ڈرایا تھا کہ آج تو تمہیں زمین میں اقتدار حاصل ہے اور تم اس ملک میں غالب ہو۔ لیکن تمہاری حالت بھی قوم نوح کی سی نہ ہو جائے (غافر ۴۰:۲۹، تفسیر مظہری ۱۰:۱۵۶)۔ ان آیات سے اشارہ ملتا ہے کہ قوم شعیبؑ اور قوم فرعون کا معروف گناہ ان سے پہلے قوم نوحؑ میں پایا جاتا تھا۔

اس سلسلہ میں قرآن حکیم میں رونگٹے کھڑے کر دینے والی دو آیات آئی ہیں جن سے ہم سرسری طور سے گزر جاتے ہیں:

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّھْلِکَ قَرْیَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِیْھَا فَفَسَقُوْا فِیْھَا فَحَقَّ عَلَیْھَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰھَا تَدْمِیْرًا وَ کَمْ اَھْلَکْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ بَعْدِ نُوْحٍ (الاسراء ۱۷: ۱۶-۱۷)	اور جب ہم کسی شہر (تہذیب) کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے مال داروں کو حکم بھیج دیتے ہیں۔ وہ حق سے سرتابی کرتے ہیں اور فسق میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تو انہیں اکھاڑ پھینکا جاتا ہے، اور نوح کے بعد کی صدیوں رنسلوں میں ہم نے کتنوں کو غارت کر دیا۔

حضرت ابوموسی اشعریؓ کی روایت (مصنف ابن ابی شیبہ ۷:۵۰۶، ح ۳۷۵۹۴) ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا درہم و دینار نے تم سے اگلی قوموں کو بھی ہلاک کیا تھا اور تم کو بھی یہی

دونوں ہلاک کریں گے۔

تو کیا عجب کہ قرآن حکیم نے ثمود کو گستاخ اور قلیل الحیاء قرار دیتے ہوئے قوم نوح کو بدکردار۔ فاسقین۔ بتایا ہے (ق ۵۰:۴۶)۔

حضرت نوحؑ کے جوابات کی حکمت: چنانچہ بحث کو ختم کرتے ہوئے حضرت نوحؑ نے کہہ دیا کہ میں نے بھلا ایسا دعویٰ کب کیا تھا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، یا میں غیب کی باتیں جانتا ہوں یا تم سے کوئی معاوضہ طلب کررہا ہوں۔ پھر مسکت بات یہ کہی کہ میں دیکھتا ہوں تم جاہلوں جیسی باتیں کرتے ہو (ھود ۱۱:۲۹-۳۱)۔ اس طرح قوم پر اس کا معاشرتی راز کھل گیا۔ قوم کو اپنے ترقیاتی اور تحقیقی کاموں کے لیے سرمایہ (فنڈز) درکار تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک وہی عزت والا تھا جو ان کے کاموں میں مال لگائے۔ علم غیب کا ذکر اشارہ کرتا ہے کہ قوم نوح کو اپنے تجارتی امور میں کل پرسوں ہونے والی باتوں کی پیشگی اطلاع سے بھی دلچسپی تھی اس سے ان کا منافع بڑھتا تھا، جیسے آج اگر کسی کو یہ معلوم ہوجائے کہ کل بازار میں تیزی آئے گی تو وہ اپنی اجناس یا حصص کو کل تک روک کر منافع کی شرح بڑھا لیتا ہے۔ حضرت نوحؑ ایسی باتیں بتاتے تو بھی کیا ضروری تھا کہ قوم ایمان لے آتی۔ اس کا کام تو ایمان لائے بغیر ہی چلتا۔ لہٰذا حضرت نوحؑ نے اس سے بھی انکار کردیا۔ جس سے یہ بات اور صاف ہوگئی کہ وہ اگر دولت مندی کا اظہار کرتے تو چودھری کہتے کہ ایمان لانے والوں کو انھوں نے مال دے کر خریدا ہے۔ مگر حضرت نوحؑ نے الزام سے پہلے ہی ثابت کردیا کہ مومنین صدق دل سے بلا کسی دنیوی غرض کے ایمان لائے تھے۔

اس تفصیل و تجزیہ پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہوگا کہ بھلا کہاں پرانے دور کی ایک دیہاتی قوم نوح کی تجارت اور کہاں نیویارک، پیرس، لندن، قاہرہ، بمبئی اور کراچی کے جیسے سٹاک ایکسچینج؛ کہاں قوم نوح کی حد سے حد لوہاری اور کہاں آج کی اسٹیل ملیں۔ بات وہی ارا ذلنا تک لوٹ آئی۔ جو لوگ کل حضرت نوحؑ کے دور میں خود کو اشراف اور اہل ایمان کو ارا ذلنا کہہ کر رد کررہے تھے آج کی تہذیب کے چودھریوں میں خود اراذل کے مقام پر لا بٹھائے گئے۔ یوں بھی ہوتا ہے۔ یونہی ہوتا ہے۔

وَ تِلۡکَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیۡنَ النَّاسِ (آل عمران ۳:۱۴۰) اور یہ دن باری باری ادلتے بدلتے رہتے ہیں ہم انسانوں میں۔

استغناء کی روحانی مثال: حضرت نوحؑ کے وسائل کا اندازہ نہیں کیا گیا۔ سرداران قوم کی دولت اندوزی کی دوڑ میں شامل ہونے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ ان کے وسائل اس تہذیب کے فروغ میں استعمال ہونے کے لیے تھے جس کی تباہی مقدر ہو چکی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا اللہ کے ایک جلیل القدر رسول کے پاس وسائل نہیں تھے۔ مثال خود رسول اللہؐ کی ہے۔ آپؐ مال دنیا سے بے نیاز تھے یہاں تک کہ امہات المومنین مہینوں دو کالی چیزوں، کھجور اور پانی، پر گزر کرتی تھیں۔ لیکن امت کی مہمات میں حضرت صدیق اکبر، حضرت عمر الفاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت عبدالرحمان ابن عوف، حضرت سعد ابن عبادہ، حضرت سعد ابن ربیع، حضرت قیس ابن سعد رضی اللہ عنہم مال و منال کے ڈھیر لگا دیتے تھے۔ حضرت نوحؑ انبیاء کے اسی سلسلہ کے رکن رکین تھے۔ ان کے اپنے اور ان کے نادار و فقیر اصحاب کے مالی اور مادی وسائل کفار کے تہذیبی وسائل سے کہیں زیادہ تھے، اور ان بزرگوں کی صناعی کا جوہر مشرکین کی صنعتوں سے کہیں بلند تھا۔ مگر اس کا تخریبی اظہار تھا نہ اس جماعت کو شان و شوکت اور حشم خدم پر ان وسائل کے استعمال کرنے سے دلچسپی تھی۔

جن لوگوں نے سفینہ نوح تعمیر کیا تھا وہ فقراء نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ امت نوحؑ کے عثمان غنی اور عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن عبادہ اور سعد ابن الربیع جیسے بزرگ تھے۔

اس پہلو سے کہ اس تہذیب کا جائزہ لیا جائے اور حضرت نوحؑ کے وسائل کا بیان ہو، ایک نظر قوم نوح کے تہذیبی مقام پر ڈال لی جائے۔ بائبل میں قوم نوح کے بارے میں مجمل بیان ہے کہ دنیا میں فساد پھیل گیا اس لیے اللہ نے طے کیا کہ نوح اور ان کے تین بیٹوں کے سوا تمام انسانوں، جانوروں، پرندوں کا نام و نشان زمین سے مٹا دے گا (تکوین ۶: ۵-۸)۔ فساد کی کوئی تفصیل بھی نہیں دی گئی سوائے اس کے کہ فرشتوں نے انسانی عورتوں سے اختلاط کیا تھا جس کی سزا انسانوں کو دی گئی۔ قوم نوح کے ظلم و جور یا گناہوں اور بدی کی بھی کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ دیگر ذرائع بھی اس سلسلہ میں کچھ مدد نہیں کرتے کیونکہ ان کا انحصار خود بائبل کے بیانات ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ کسی کو یقین نہیں کہ قوم نوح کسی انتہائی ترقی یافتہ دور میں رہتی تھی، باوجودیکہ ان کے سامنے سفینہ نوح کی مثال موجود ہے۔ مگر سفینہ نوح کو بھی ایک معمولی کشتی سے زیادہ کچھ نہیں

سمجھا گیا۔تاہم آخر میں یہی سفینہ نوح ہمیں اس تہذیب کا پتا دے گا جسے کلیتاً مٹانا ضروری ہوگیا تھا۔اس سمت میں فہم تاریخ کا واحد ذریعہ قرآن حکیم ہے۔

قرآن حکیم میں حضرت نوحؑ کا ذکر ۲۹ سورتوں میں ۴۳ مقامات پر آیا ہے۔ایک سورت خود حضرت نوحؑ سے موسوم ہے۔یہ سورت اُس زمانہ کی تہذیبی ترقی کا معیار متعین کرتی ہے۔بائبل کی پہلی کتاب تکوین میں سفینہ،اس کی تعمیر،سفر اور منزل کی کچھ تفصیلات کے باوجود پیرایۂ بیان قرآن حکیم سے مختلف ہے۔

سات مثالوں کی منطق: سورۃ نوح میں قوم کو خطاب کرتے ہوئے پہلے انعامات کا ذکر ہے پھر حضرت نوحؑ کا یہ بیان آتا ہے کہ اللہ کی توقیر (وقار) تمہارے عقیدہ میں نہیں ہے (نوح ۷۱:۱۳) اس کے بعد سات آیات میں اللہ کے وقار کی نشانیاں بتائی گئی ہیں۔اللہ کی توقیر سے غفلت اشارہ کرتی ہے کہ قوم نوح کی ترقی کا معیار بلند تھا۔ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشراف قوم کا خود کو سب سے زیادہ بلند مرتبہ اور ترقی یافتہ سمجھتے تھے۔قرآن حکیم نے سرکش قوم سے حضرت نوحؑ کا آخری خطاب نقل کیا ہے۔اس پر نظر کی جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔

حضرت نوحؑ نے کہا:

آیت ۱۴: دیکھتے نہیں اللہ نے تمہیں کیسے مرحلوں میں ارحام کے اندر پیدا کیا؛ آیت ۱۵: اور کیسے سات آسمان طبق بر طبق بنائے؛ آیت ۱۶: اور ان میں چاند کو روشنی اور سورج کو چمک دی؛ آیت ۱۷: اور تمہیں خاک سے اس طرح نکالا جیسے نباتات کو اگاتا ہے؛ آیت ۱۸: پھر تم اسی خاک میں لوٹ جاؤ گے اور اسی سے دوبارہ باہر آؤ گے؛ آیت ۱۹: اور اللہ نے اسی زمین کو تمہارے سامنے فرش کی طرح پھیلا دیا؛ آیت ۲۰: کہ تم اس میں کشادہ وفراخ راستے بناؤ اور ان میں سیر و سفر کرو۔(نوح ۷۱:۱۴-۲۰)

ممتاز مفسرین نے ان آیات کو خصوصی اہمیت دی ہے۔آیات کی ترتیب سے ابوحیان اندلسی کی شرحیں حسب ذیل ہیں:

آیت ۱۴:علم انفس: انفس فکر سے قریب تر ہوتے ہیں (امام اندلسی، بحر المحیط ۸: ۳۳۴)۔انسانی اعتبار سے تکوین کے دو پہلو ہیں: ایک آفاق کہ جو کچھ ناک کے نیچے سے آسمانوں

کی بلندیوں تک پھیلا ہوا ہے اسے دیکھ کر آدمی میں غور وفکر اور شکر واحسان کا ذوق پیدا ہو، اور دوسرا وہ جو خود انسان کے وجود کے اندر ہے۔ حضرت علیؓ کے ایک شعر کا مفہوم ہے کہ تم کائنات کے عالم صغیر کو دیکھتے ہو، ذرا اپنے انفس پر بھی تو نظر کرو کہ یہاں بھی ایک عالم کبیر کی حیرانیاں تمہاری منتظر ہیں۔ چنانچہ قوم نوح کو سب سے پہلے انفس کی طرف توجہ دلائی گئی۔ یہی وضاحت امام اندلسی کا منشاء ہے۔

آیت ۱۵: علوی وسفلی عالم: زیادہ ہدایت یافتہ آدمی عالم علوی اور عالم سفلی دونوں میں فکر کرتا ہے (امام اندلسی، بحرالمحیط ۸: ۳۳۴)۔ انفس کے بعد قوم نوح کو فوراً اس عریض و بسیط کائنات کی طرف متوجہ کیا گیا۔ یعنی اگر تم کو ہدایت ملی ہے تو اب اپنی ذات کی تکوین سے بلند ہو کر آسمانوں کی تکوین کا مقصد سمجھو۔ یہ بڑا منطقی طریقہ تھا کہ انسانی ذات پر توجہ دلا کر ایک دم کائنات کی طرف گفتگو کا رخ بدل دیا۔ یعنی ابھی ایک حیرت سے نہ نکلے تھے کہ ایک اور بڑی بات سامنے رکھ دی۔

آیت ۱۶: چاند اور سورج کی حقیقت کا فہم علم ہیئت میں معرفت کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ اس علم کے ماہرین کے نزدیک چاند سورج کا بیان حضرت نوحؑ کی دعوت کی صحت پر برہان قاطعہ تھا اور اللہ کی عظمت وقدرت کی واضح دلیل تھا (امام اندلسی، بحرالمحیط ۸: ۳۳۴) جس پر سوال سے یہ تقریر شروع ہوئی تھی۔ ابن کثیر (ر: تفسیر ۲۹: ۶۱۷) نے چاند سورج کے بیان سے ان دونوں کی منزلوں اور اس سے علم الحساب مراد لیا ہے۔ ان تفصیلات سے ایک اور خفی نکتہ بھی ہویدا ہوتا ہے۔ آسمان میں اجرام فلکی کی کثرت طبیعیات کا ظہور ہے جس نے قوم نوح کو بیک وقت کثرت پسند اور مادیت کا غلام بنا دیا تھا، جبکہ معقولیت کا تقاضہ تھا کہ یہ انعامات انہیں شکر گزار بناتے۔ اس نکتہ کی طرف حکیم الامت مولانا تھانوی نے بڑے بلیغ انداز میں توجہ دلائی ہے کہ امام سیوطی نے درمنثور میں قتادہ کا قول دیا ہے کہ وہ لوگ دنیا کے زیادہ حریص تھے، چنانچہ مال اور اولاد کی کثرت زیادہ سرکشی کا سبب بن گئی (مولانا تھانوی، بیان القرآن ۱۱۷۵-۱۱۷۶)۔ امام اندلسی نے مزید وضاحت کی کہ قوم نوح کے سردار اپنے شرف اور برتری کا سبب مال اور اولاد کی کثرت کو سمجھتے تھے، جبکہ یہی دونوں باتیں آخرت میں خسارہ کا سبب بن گئیں۔ بہرحال اس سلسلہ

میں اہم نکتہ یہ ہے کہ حضرت ادریس کے دور میں فلکیات و ارضیات کے علوم میں بڑے انقلابی اضافے ہوئے تھے اور وہ تمام علوم قوم نوح کی علمی میراث اور عام لوگوں کے ذخیرہ معلومات میں موجود تھے، ورنہ اس مجمل انداز میں ان علوم کی طرف اشارہ نہ ہوتا۔

آیت ۱۷: ارضی مخلوقات: تمہیں رفتہ رفتہ زمین سے نباتات کی طرح اگایا، جو عام مشاہدہ ہے۔ (امام اندلسی، بحرالمحیط ۸: ۳۳۴)۔ اس آیت میں بڑے بلیغ انداز میں بناتات میں جان ہونے کا اثبات ہے۔ موجودہ تہذیب میں یہ شرف ہندستان کے ایک ماہر بناتات جگدیش چندر بوس (۱۸۵۸۔۱۹۳۷ء) کو حاصل ہوا تھا۔ دلچسپ نکتہ یہ کہ گوشت کے جاندار ہونے کی وجہ سے مویشیوں کے گوشت سے پرہیز کرنے والی قوم کے ایک سائنسداں نے سبزی خور قوموں کو بتایا کہ یہ گھاس پات اور نباتات بھی مویشیوں کی طرح جان رکھتے ہیں، سانس لیتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔ حضرت نوحؑ کی قوم کو جب یہ بتایا کہ تم کو زمین سے نباتات کی مانند پیدا کیا گیا تو ظاہر ہوتا ہے وہ بناتات میں زندگی کے قائل تھے۔

آیت ۱۸: دوسری زندگی: پھر اسی زمین میں دفن کردئے جاتے ہو، تو اس سے دوبارہ اٹھائے جانے میں کیا تعجب ہے۔ (بحرالمحیط ۸: ۳۳۴)۔

آیت ۱۹: زمین کی خوبیاں: اسی زمین کو تمہارے لیے پھیلا دیا گیا۔ زمین کروی ہے مگر اس کے باوجود ظاہر میں مسطح دکھائی دیتی ہے (امام اندلسی، بحرالمحیط ۸: ۳۳۴)۔ یہ اس تناسب کا اشارہ ہے جو انسان کے قد و قامت اور زمین کی وسعت و کشادگی کے مابین ہے۔ انسان کے سامنے زمین ایسی ہی ہے جیسے ایک میدان دری یا چٹائی کی طرح سیدھا سپاٹ بچھا ہو۔ اس مادی حقیقت کے فہم کے لیے فلکیات اور طبیعیات میں درک ضروری ہے۔

آیت ۲۰: شاہراہوں کا وجود: قوم نوح سے کہا گیا کہ اس زمین میں تم کشادہ راستے بنالو اور شوق سے چلو پھرو سیر و سفر کرو۔ امام اندلسی نے کہا کہ زمین چونکہ ظاہر میں کروی نہیں دکھائی دیتی اس لیے اس پر راستے بھی وسیع ہیں (امام اندلسی، بحرالمحیط ۸: ۳۳۴)۔

تفاسیر کی روشنی میں ان آیات سے کچھ تہذیبی امور سامنے آتے ہیں اور قوم نوح کی تمدنی ترقی میں دستگاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک اصول ہے کہ مخاطب کے مبلغ علم کے مطابق مثال دی جاتی ہے۔اس اصول کی روشنی میں ان آیات پر ایک بار پھر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو قائل کرنے کے لیے جو باتیں کہی تھیں وہ سب ان تمام موضوعات پر قوم کے علم وآگہی کے مطابق تھیں اور قوم کے سردار وہ سب باتیں خوب سمجھ رہے تھے۔

آیت ۱۴: قوم نوح توالد وتناسل، حمل اور وضع حمل اور رحم مادر میں جنین کی مرحلہ وار تبدیلیوں کی طبیعیاتی اور حیاتیاتی تفصیل سے آگاہ تھی۔

آیت ۱۵: انہیں فلکیات کا علم تھا۔ حضرت ادریسؑ کا زمانہ کچھ بہت دور کا نہیں تھا۔ علوم فلکیات اور ریاضی میں ان کے اضافے قوم نوح کی علمی میراث تھے۔

آیت ۱۶: وہ چاند اور سورج کی روشنی کے فرق سے واقف تھے۔

آیت ۱۷: وہ زراعت، باغبانی اور نباتیات کا گہرا علم رکھتے تھے۔

آیت ۱۸: ان کو معلوم تھا کہ کھیتی پکتی ہے، کٹتی ہے، بھوسہ زمین میں مٹی ہوجاتا ہے اور پھر اس زمین سے نئی فصل نکلتی ہے؛ پھل پکتے ہیں، شاخوں سے گرتے ہیں، مٹی میں مل کر اسی درخت کے لیے کھاد بنتے ہیں اور اسی درخت پر از سر نو پھل نکلتے ہیں۔ یہ فقط مشاہدہ کی بات نہیں تھی۔ مشاہدہ تو یہ ہے کہ کھجور اور سیب کے درختوں سے پکے پھل جھڑتے ہیں اور "ضائع" ہوجاتے ہیں، لیکن علم بتاتا ہے کہ درخت کھاد کے لیے انسان، کسان، باغبان کا انتظار نہیں کرتا اور اس کے پھل خود اس کی غذا ہیں۔ یہ زراعیات کا علم ہے جو ظاہر ہے قوم نوح کو حاصل تھا۔ امام قرطبی (الجامع لاحکام القرآن ۱۸:۳۰۶) نے حضرت حسن بصریؒ کے حوالہ سے اور امام ابوحیان اندلسی (بحر المحیط ۸: ۳۳۴) نے لکھا ہے کہ فن زراعت میں قوم نوح کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ وہ سال میں نہیں ہر مہینہ میں دو فصلیں پیدا کرتے تھے۔ جدید سائنسی اصطلاح میں بات کرنے کی اجازت ہو تو ماہانہ دو فصلیں پیدا کرنے کے لیے اس قدر قدیم قوم سبزانہ (گرین ہاؤس۔greenhouse) کا بھی کوئی زیادہ ہی ترقی یافتہ نظام ایجاد کر چکی تھی۔ غور کیا جائے تو موجودہ تہذیب اور مادی علم کا فروغ ابھی اس مقام تک نہیں پہنچا جہاں قوم نوح اپنی تباہی سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ کچھ مورخین اس بات کو مادی اور محسوس دلیل کے طور پر قبول نہیں کریں گے، لیکن زمانہ قبل تاریخ کے بارے میں بے شمار باتیں بغیر کسی حسی دلیل

کے رائج ہیں اور مزعومات کو حقیقت تسلیم کیا جاتا ہے۔اس کی کوئی حسی دلیل نہیں کہ عہد فراعنہ کی ہیرو غلیفی تحریر سے جو کچھ مورخین نے باور کرلیا ہے وہ بعینہ وہی ہے جو اس زبان کے تصویر سازوں نے سوچا یا لکھا تھا۔جہاں تک مہینہ میں دو فصلیں پیدا کرنے کا تعلق ہے تو جہاں اس کا تعلق جینیاتی کاریگری (genetic engineering) سے ہے وہاں قوم نوح کے مادی ارتقاء کا ثبوت بھی ہے۔

آیت ۱۹: زمین کا فرش زندگی کے لیے قابل استعمال ہے۔یہ صرف کوہستانی یا دریائی ہے نہ فقط ریگزار یا گیاہ زار۔اس کے انتہائی گرم استوائی منطقوں میں خنکی کی لہر آتی ہے اور انتہائی سرد قطبی علاقوں میں موسمی حرارت کے دن آتے ہیں۔ضروری نہیں کہ قوم نوح نے ساری اقلیموں کا دورہ کیا ہو۔لیکن طوفان نوح میں ساری زمین غرق ہوئی تھی۔تو ثابت ہوتا ہے کہ قوم نوح تمام منطقوں کی طبیعیاتی کیفیات سے فی الجملہ باخبر تھی اور موسمی تبدیلیوں سے استفادہ کے قابل تھی، جیسا کہ مہینہ میں دو فصلوں سے باور آتا ہے۔

آیت ۲۰:اس زمین پر قوم نوح نے ایسی کشادہ و فراخ سڑکیں تعمیر کیں جن پر کلوں سے چلنے والی سواریوں میں سفر کرتے ہیں۔آیت میں یہاں امر ہے کہ سڑکیں بنالو۔امام بغوی (معالم التنزیل ۸:۲۳۲) نے سُبُلًا فِجَاجًا کے تحت اللفظ معنی بیان کیے ہیں کہ چلنے پھرنے کے لیے "فراخ راستے" موجود ہیں۔امام بیضاوی (انوار التنزیل ۵:۳۹۴) اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی (تفسیر مظہری ۱۲: ۷۵-۷۶) کہتے ہی کہ تَسلُکُوْا کے اندر اتخاذ کا معنی پوشیدہ ہے یعنی تاکہ تم زمین پر کشادہ راستے اپنے چلنے کے لئے بنالو۔مولانا شبیر احمد عثمانی (تفسیر عثمانی ۳:۷۷۷) نے کہا کہ ایک شخص چاہے اور وسائل ہوں تو ساری زمین کے گرد گھوم سکتا تھا۔راستہ کی کوئی رکاوٹ نہیں۔ابن کثیر (ر:تفسیر ۲۹:۶۱۷) نے زیادہ بدیہی بات پر توجہ دلائی کہ تم اس زمین کے کشادہ راستوں ہی پر تو چلتے پھرتے ہو۔یعنی راستے تو تم نے بنا ہی لئے ہیں اور ان پر جب جی چاہے سیر و سفر کرتے ہو۔

دیہاتیت اور مدنیت میں تفاوت: راستوں کی فراخی کسی تہذیب کا معیار تمدن طے کرتی ہے۔جو لوگ قوم نوح کو کسی دیہات کی رہنے والی بے شعور اور مادی تہذیب و ترقی سے نابلد قوم سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں ان کے لیے یہاں روشن دلیل ہے۔دیہات میں راستے نہیں بنائے

جاتے بلکہ گھروں کے درمیان چھوٹی ہوئی جگہ آمد ورفت کے لیے استعمال ہونے لگتی ہے اور انہی کو راستے بلکہ گلیاں اور گلیارے کہا جاتا ہے۔ فراخ وکشادہ راستہ دلیل ہے بیک وقت کئی گاڑیوں سواریوں کے چلنے کی۔ کشادہ سڑکیں گاڑیوں میں سفر کے لیے ہوتی ہیں، پیدل چلنے والے غیر متمدن دیہاتیوں کے لیے نہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ گاڑیاں جتنی کثرت سے ہوں گی اتنی ہی فراخ سڑکیں درکار ہوں گی۔

قرآنی اسلوب بیان کے پیش نظر یہاں کہا یہ جارہا ہے کہ تم ترقی وتمدن کے اس مقام پر ہو کہ تمہاری سواریوں کی آمد ورفت کے لیے چوڑی سڑکیں ہیں اور اللہ نے اس کا شعور اور اس کے وسائل تم کو مہیا کیے پھر بھی تم اس کی قدر وعظمت، اس کے وقار اور کبریائی کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کو ان انعامات کا سبب سمجھنے کی حماقت کرتے ہو۔ بالواسطہ طور پر اس کا لب لباب یہ ہے کہ ایک طرف تو تمہارے علم وعقل کا یہ عالم ہے کہ تم تمدن کی بلندیاں سر کرتے جارہے ہو، دوسری طرف سفاہت و بے وقوفی کی انتہا یہ کہ اپنی ترقیات کا سہرا بے جان اصنام کے سر باندھ کر خود اپنی نگاہوں میں پست اور ذلیل ہوجاتے ہو۔

ایک تمدنی مرض کی نشان دہی: سورہ نوح کی آیات ۲۲۔۲۳ بھی تمدنی نقطہ نظر سے توجہ طلب ہیں۔

وَ مَکَرُوا مَکرًا کُبَّارًا وَقَالُوا لَاتَذَرُنَّ اِلٰھَتَکُم۔ انہوں نے داؤ کیا ہے، بڑا داؤ۔ اور کہا ہرگز اپنے معبودوں کو مت چھوڑنا۔

مفسرین نے مکر کے معنی میں سخت فریب، خطرناک سازشیں، بھاری سازش، نیچی ذات والوں کے ساتھ مکاری، بہکاوے وغیرہ بتائے ہیں۔ قرآنی سیاق وسباق میں صاف مطلب یہی ہے کہ قوم کے سردار اپنے متبعین اور نچلے طبقات کو فریب دیتے تھے کہ حضرت نوحؑ کی باتیں نہ سنیں اور اپنے دیوتاؤں کی پرستش جاری رکھیں۔ مکر سے ظاہر ہے کہ وہ خود جانتے تھے کہ ان بتوں سے کوئی فیض نہیں پہنچتا لیکن عام لوگوں کو یہی سکھاتے تھے کہ سب کچھ انہی کی کارسازی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے وحدانیت کا پہلا تمدنی نشانہ گناہ اور معاشرتی عوارض ہوتے ہیں جبکہ دیوتاؤں کی کثرت انسان کو جرائم اور معاصی کی چھوٹ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاطر سردار اور چالاک

پروہت اور پجاری جان بوجھ کر شرک کی تبلیغ کرتے ہیں۔قوم نوح کے سیدھے سادے لوگ ان دھوکہ بازوں کے بہکاوے میں آجاتے تھے۔ ہر دور میں مادی ترقیات کا ماحصل بھی یہی رہا ہے۔ چنانچہ جب حضرت نوحؑ کے اصحاب کی عقل و دانش پر سرداران قوم اعتراض کرتے تھے تو ان کے پیش نظر ان کے وہی بے وقوف پیرو ہوتے تھے جو آسانی سے ان کے دام فریب میں آجاتے تھے۔ یہ موازنہ درحقیقت ان سرداروں کی بے عقلی کی دلیل تھا۔لیکن اس سے قطع نظر زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ عام لوگوں کو اس قسم کا دھوکہ فریب دینا ان سرداروں اور قوم کے چودھریوں کی عادت تھی۔ یعنی فریب صرف اسی ایک بات میں محدود نہ تھا بلکہ وہ ہر معاملہ میں اوروں کو دھوکہ دینے، ان کے خلاف سازشیں کرنے کے عادی تھے،جیسا کہ تجارتی امور میں قوم شعیب کا طریقہ تھا۔اس میں ایک تمدنی مرض کی نشان دہی ہے۔

ایک کہاوت ہے دھوکہ دیے بغیر آدمی مالدار نہیں بنتا۔کہیں نہ کہیں چھوٹا بڑا دھوکہ،فریب کیا جائے،حق دار کا حق چھینا جائے،حیلوں بہانوں سے دوسروں کا مال ہتھیا لیا جائے،مہاجنی نظام اسی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور آج بھی بالکل اسی طریقہ پر کام کرتا ہے،کل چالاک کاہن اور پروہت ان فریب کاریوں پر تقدیس کا پردہ ڈال دیا کرتے تھے،آج اس قسم کے مکر وفن سے سادہ لوح لوگوں کی حق تلفی کو چالاک زردار اور قانون ساز افراد اور ادارے دنیوی قانون کی تائید و سرپرستی مہیا کر دیتے ہیں۔آج بھی کسی کی مجال نہیں جو ایسے معاشی ہتھکنڈوں اور تجارتی بدمعاشیوں کو غیر قانونی تو کجا غیر اخلاقی بھی کہہ سکے؛کل بھی سرداران تہذیب کے اس عمل کے خلاف زبان کشائی قابل عقوبت گناہ سمجھی جاتی تھی اور بولنے والے کی جاں بخشی ہوجاتی تب بھی برادری سے باہر اور شہر بدر تو کر ہی دیا جاتا تھا اور اس سے پہلے اس کا مال اسباب جائداد سب بحق ریاست ضبط کرلی جاتی تھی۔ آج بھی بنک، بیمہ کمپنیاں اور مہاجنی ادارے جفاکشی سے کچھ پس انداز کرنے والوں کی زندگی بھر کی بچت پر قبضہ کر کے ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتے ہیں حتیٰ کہ بعض مہذب اور مالدار ترقی یافتہ ملکوں میں قانوناً وہ ادھار خریداری کے اہل بھی نہیں رہتے۔

کم و بیش یہی صورت قوم نوح کے ساتھ بھی تھی۔ جو گروہ اپنی مالداری اور سیاسی فوقیت کی وجہ سے دین و مذہب کے نام پر غریب اور کم علم لوگوں کو دھوکہ دے سکتا ہے اسے دغا و فریب

سے دولت کمانے میں بھلا کیا عار ہوگی۔اس مکر مرکب کو قرآن حکیم نے قوم نوح کا مَکرًا کُبَّارًا بڑی بھاری چال قرار دیا ہے۔اس قوم کی سازشیں اور مکاریاں، بہکاوے حضرت نوحؑ کے لیے تو ایذا رساں تھے ہی خود قوم کے غریبوں اور نچلے طبقات کے لیے سوہان روح تھے۔اور یہ بات دنیا کی ہر تہذیب کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی (تفسیر مظہری ۱۲: ۷۶) نے کہا کہ سرداروں کا مکر یہ تھا کہ وہ حضرت نوحؑ کو دکھ پہنچانے اور کفر کرنے پر لوگوں کو ابھارتے تھے، اور نچلے طبقہ کا مکر یہ تھا کہ وہ حضرت کو طرح طرح کے دکھ پہنچاتے تھے۔یہی ان کی تدبیر تھی جسے مکر کہا گیا ہے۔امام بغوی (معالم التنزیل ۸/ ۲۳۱) نے اس موضوع پر چار اقوال درج کیے ہیں: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ لوگ بڑا بول بولتے تھے؛ ضحاکؒ نے کہا اللہ پر افتراء باندھتے تھے اور اس کے رسولوں کی تکذیب کرتے تھے؛ بعض لوگوں نے کہا رؤسا اپنے متبعین کو حضرت نوحؑ پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔ایک قول حضرت نوحؑ کے قتل کی سازش کا بھی ہے۔

ڈیڑھ ہزار سال عمر کی تہذیب: قوم نوح کو اس مکر و فریب کی عمارت بنانے کے لیے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کی مدت ملی تھی۔بائبل کے مطابق حضرت ادریسؑ اخنوخ کی عمر ۶۵ سال تھی جب ان کے گھر میں متوشلح کی ولادت ہوئی، اور متوشلح ۱۸۷ سال کے تھے تب لمک پیدا ہوئے، پھر لمک کی عمر ۱۸۲ سال ہوئی تب ان کے ہاں حضرت نوحؑ کی ولادت ہوئی۔اس طرح متوشلح اور حضرت نوح کی پیدائشوں کے درمیان ۴۰۹ سال کا وقفہ تھا۔اسی حساب کی رو سے حضرت ادریسؑ کے رفع مکان کا واقعہ ولادت نوح سے ۶۹ سال پہلے پیش آیا تھا۔مختصر یہ کہ بائبل کی رو سے حضرت نوحؑ کی ولادت سے ۳۴۰ سال پہلے حضرت ادریسؑ بنی آدم میں تہذیب و تمدن، ایجاد و اختراع کی بنیاد ڈال چکے تھے اور مصحفہ اخنوخ کی رو سے ان کے والد یرد ابن مہلائیل کے زمانہ میں تقریباً ۱۰۰ سال پہلے پختہ مکانات بنانے رواج پڑ چکا تھا۔گویا جب حضرت نوحؑ کو نبوت ملی تو قوم کی تہذیب و ترقی پر کم و بیش پانچ صدیاں بیت چکی تھیں۔ترقی کا یہ سلسلہ حضرت نوحؑ کے زمانہ میں مزید ۹۵۰ سال تک جاری رہا (العنکبوت ۲۹: ۱۴)۔کسی تہذیب کی مسلسل بقاء اور ارتقاء کے لیے یہ بہت طویل مدت ہے۔معلوم انسانی تاریخ میں لگاتار ترقی کے لیے بہت زیادہ تہذیبوں

کو اتنی طویل مدت نہیں ملی۔طویل ترین مدت مصر کی فرعونی تہذیب نے پائی تھی۔

اب یہ اندازہ کرنا سہل ہے کہ تقریباً ۱۵۰۰ سال کے لگاتار تدریجی ارتقاء نے قوم نوح یا بنی قابیل و بنی شیث کے کفار کو علوم وفنون کے کس مقام پر پہنچایا ہوگا اور تمدنی وتہذیبی تفوق کا وہ کیا معیار تھا جس نے اس قوم کے عوام وخواص سب کو اس قدر مغرور، سرکش، ظالم و جابر اور انسانی خوبیوں میں اس درجہ بے حس بنا دیا تھا۔

اس قوم کی مورخانہ تاریخ نہیں لکھی جاسکتی کیونکہ ان کی کوئی بھی نشانی زمین پر باقی نہیں رہی۔تنہا بائبل اس بارے میں کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کرتی۔مگر قرآن حکیم اور بائبل دونوں کی مدد سے اس دور کے واقعات سے اس تہذیب کی بلندی کو حسابی طور پر سر کیا جاسکتا ہے۔

قوم نوح کی تہذیب کو بلا خطا ناپنے کا واحد پیمانہ سفینہ نوح ہے۔اس کے لیے تفصیلی اور قدرے صبر آزما مطالعہ درکار ہے۔

سفینہ اور فسانہ: سفینہ نوح کی مروجہ پیمائشوں کا مصدر بائبل ہے۔مفسرین قرآن نے اس باب میں جو کچھ جمع کیا ہے وہ وہیں سے اٹھایا ہے۔وہاں ایک ظاہری تضاد ہے۔سامان اور مسافروں کی جو کچھ تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان کے لیے سفینہ چھوٹا تھا۔یہودیوں کی ہیبرو (عبرانی) انگلش بائبل (Hebrew English)، کیتھلک (Catholic) بائبل، پروٹسٹنٹ انگلیکن (Protestant Anglican) فرقہ کی بائبل کے کنگ جیمس نسخہ اور نیوانٹرنیشنل نسخہ میں آتا ہے کہ حضرت نوحؑ کو سفینہ بنانے کا حکم الٰہی ہوا اور جیسا کہ بائبل کا عام ذوق بیان ہے، سفینہ کی تمام پیمائشیں بھی ان کو پیشگی بتا دی گئیں کہ اس کا طول تین سو ذراع، عرض پچاس ذراع اور اونچائی تیس ذراع رکھی جائے۔قرآنی تفاسیر میں ذراع کا لفظ ہی آیا ہے، البتہ بائبل میں کیوبٹ (cubit) کا پیمانہ استعمال کیا گیا ہے۔بائبل کے اردو نسخہ تیرا کلام میں ہاتھ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔جدید شارحین توراۃ کے مطابق عہد قدم میں کیوبٹ کے دو پیمانے تھے: چھوٹا اور بڑا۔چھوٹا پیمانہ کہنی سے انگلیوں تک تھا جو گز سے چھوٹا تھا۔بڑا کیوبٹ بھی کہنی سے انگلیوں تک تھا اور پھر ایک بالشت کا اضافہ بھی تھا۔جدید تحقیقات کے مطابق چھوٹا کیوبٹ ۱۷ء۵/انچ یا ۴۴ء۵۰ سینٹی میٹر لمبا تھا اور بڑا کیوبٹ ۲۰ء۴/انچ یا ۵۲ء۳ سینٹی میٹر کا تھا۔المنجد اردو (۱۶۲) میں اس سے چھوٹا کیوبٹ مراد لیا گیا ہے کہنی

سے بیچ کی انگلی کے سرے تک۔ البتہ ہانز ویہر نے عربی انگریزی لغت معجم اللغۃ العربیہ المعاصرہ میں اس کی سات مختلف پیمائشیں دی ہیں جن میں کم سے کم ۵۸ سینٹی میٹر سے ۸۰ سینٹی میٹر تک ہے۔

جو مسئلہ میں پیش کرنے والا ہوں غالباً وہی دشواری بائبل کے نئے شارحین کو بھی پیش آئی اس لیے سفینہ میں گنجائش بڑھانے کی خاطر ان کی رائے ہے کہ اس کی تعمیر میں بڑا کیوبٹ استعمال کیا گیا تھا، حالانکہ وہ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ حضرت نوحؑ کے زمانہ میں چھوٹا کیوبٹ مستعمل تھا۔ اس کے علاوہ بڑے کیوبٹ کی تشریح میں بھی انہیں تسامح ہوا ہے۔ یہ بائبل کی کتاب ا۔سموئیل ۱۷:۴ سے لیا گیا ہے جہاں جالوت کا قد چھ کیوبٹ اور ایک بالشت (تقریباً نو فیٹ یا تین میٹر) بتایا گیا ہے۔ تاہم عبارت میں مراد اس کا کل قد ہے یعنی چھ (چھوٹے) کیوبٹ اور ایک بالشت، ہر کیوبٹ پر ایک بالشت کا اضافہ نہیں ہے۔ لہٰذا بائبل کے کیوبٹ سے چھوٹا پیمانہ ہی مراد لیا جائے گا، یعنی انچوں میں ۱۷ء۵ کا۔ اس لحاظ سے سفینہ کا طول ۱۴۵ء۸۴ گز، عرض ۲۴ء۳ گز اور ارتفاع ۱۴ء۵۸ گز قرار پاتا ہے۔ اعشاری پیمانہ میں طول ۱۳۳ء۵ میٹر، عرض ۲۲ء۲۵ میٹر اور اونچائی ۱۳ء۳۵ میٹر ہوئی۔ سمجھنے کی آسانی کے لیے نئے پیمانوں میں سفینہ کا طول ۱۳۴ میٹر (۱۴۶ گز)، چوڑائی ۲۲ میٹر (۲۴ گز) اور اونچائی ۱۳ میٹر (۱۵ گز) کہی جاسکتی ہے۔

اسرائیلیات پر بغوی کا تبصرہ: عربوں کے پاس ذراع کا مطلب ایک گز یا کندھے سے انگلیوں تک کا ناپ تھا۔ علامہ پانی پتی (تفسیر مظہری ۲۹:۶) نے کہا کہ ذراع کا مطلب شانہ سے انگلیوں تک پورا ہاتھ۔ شانہ سے انگلیوں تک ہے، یعنی آدھا گز مراد نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ اور دیگر علماء کے اقوال کے مطابق اسلامی نقطۂ نظر سے سفینہ کی پیمائش بائبل کی تصریح کے مقابلہ میں دوگنا یا کم سے کم ڈیڑھ گنا تھی۔ تفاسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منسوب ایک قول تو وہی اسرائیلی روایات کا ہے جسے مستند نہیں مانا جاسکتا کہ سفینہ کا طول ۳۰۰ ذراع، عرض ۵۰ ذراع اور اونچائی ۳۰ ذراع تھی، ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے اور ابن مردویہ نے حضرت سمرہؓ بن جندب سے بھی یہی پیمائش بتائی ہے (مظہری ۲۹:۶) یہ بھی اسرائیلی روایت ہے جو اصول درایت پر پوری نہیں اترتی۔ حضرت ابن عباسؓ کا دوسرا قول ۱۲۰۰ ہاتھ اور ۶۰۰ ہاتھ کا ہے، جو بجائے خود دلیل ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے منسوب ان اقوال کی صحت مشکوک ہے۔ یہ تفصیلات

امام بغوی، امام بیضاوی، ابن کثیر اور پانی پتی وغیرہ نے سورہ ھود کی تفسیر میں جمع کی ہیں۔امام بغوی نے حضرت حسن بصری کے حوالہ سے طول وعرض ۱۲۰۰ ہاتھ اور ۷۰۰ ہاتھ بھی بیان کیا ہے جس کا ذکر امام قرطبی (الجامع لاحکام القرآن) نے بھی کیا ہے۔ان تفصیلات پر معالم التنزیل میں امام بغوی کا بے لاگ تبصرہ یہ ہے کہ سفینہ کے طول وعرض اور اس کے مسافروں نیز بعض (جانوروں) کی تخلیق کے بارے میں باتیں جن کا ذکر طبری اور سیوطی نے بھی کیا ہے اسرائیلیات ہیں جو یہودیوں نے گڑھ لی تھیں اور مدت دراز میں رائج ہو گئیں، جاہلیت میں بھی معروف ہو گئی تھیں، نیز یہ کہ کشتی کے بارے میں اہل توراۃ کے زعم جھوٹ برابر ہیں (سورہ ھود ۱۱ / حاشیہ بغوی ۴: ۱۷۴-۱۷۵)۔علامہ شبیر احمد عثمانی (تفسیر عثمانی ۲: ۱۳۷) نے لکھا ہے: کہتے ہیں کشتی سالہا سال میں تیار کی۔کشتی کیا تھی بڑا جہاز تھا۔مفسرین نے اس کی تفصیل میں بہت مبالغہ آمیز اور عجیب وغریب اسرائیلی روایات بیان کی ہیں۔ابو حیان اندلسی نے بحر المحیط میں ان پر تبصرہ میں کہا کہ جہاز کے طول وعرض، مدت، مقام میں اختلاف ہے۔ان میں کوئی بات صحیح نہیں ہے۔

ان تبصروں سے اتنی بات ثابت ہے کہ بائبل میں سفینہ کی جو پیمائش دی گئی ہے وہ قابل قبول نہیں ہے۔ایسا کیوں نہیں ہے، اس کا جواب آگے آرہا ہے۔

عہد نوح کی عمارتی لکڑیاں: بائبل کے مختلف نسخوں میں مختلف درختوں کی لکڑی کا استعمال بتایا جاتا ہے۔ہیبر وانگلش (HEB-Hebrew-English) بائبل اور پروٹسٹنٹ کنگ جیمس نسخہ میں گوفر کی لکڑی بتایا جاتا ہے؛ اردو نسخہ تیرا کلام میں اسے گوپھر لکھا گیا ہے۔اس کے بارے میں بائبل کے ماہرین کہتے ہیں کوئی نہیں جانتا یہ کونسا درخت تھا۔بائبل کے جدید بین الاقوامی نسخہ میں سرو کی لکڑی کہا گیا ہے۔کیتھلک بائبل میں اسے گوند والی اور چپکنے والی لکڑی کہا گیا ہے۔قرآن حکیم کے مفسرین عموماً اسے ساج یا ساگوان کی لکڑی بتاتے ہیں۔بحر المحیط میں ساج یا شمشاد کہا گیا ہے اور یہ کہ لکڑی جبل لبنان سے لائی گئی تھی۔ابن کثیر کے اردو ترجمہ میں اسے ساگوان (teak) بتایا گیا ہے۔ممکن ہے کسی قدیم زبان میں ساج یا ساگوان ہی کو گوفر (gopher) کہا جاتا ہو۔ماحصل یہ کہ حتمی طور پر کہنا مشکل ہے کہ سفینہ کے لیے کونسی لکڑی استعمال کی گئی تھی، تاہم بزرگ مفسرین کی اکثریت حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے حق میں ہے۔لکڑی جو بھی ہو، ان تفصیلات سے اتنا ضرور

طے ہے کہ حضرت نوح کے زمانہ میں ان قسموں کی لکڑیاں تعمیرات اور کشتیاں بنانے میں مستعمل تھیں۔

سفینہ کی مدت تعمیر: بحرالمحیط میں علامہ اندلسی نے سفینہ بنانے کی مدت ۲۰ سے ۳۰۰ سال تک نقل کی ہے۔ایک روایت ہے کہ لکڑی چھیلنے میں ۲۰ سال لگے، دوسری روایت ہے کہ چھیلنے، کاٹنے اور خشک کرنے میں ۳۰۰ سال لگے۔امام قرطبی نے قاضی ابوبکر ابن عربی سے روایت کی ہے کہ ۴۰ سال میں کشتی تیار ہوئی۔ابن کثیر نے بھی ۴۰ سال کی ایک روایت نقل کی ہے۔معالم التنزیل میں امام بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جہاز بنانے میں دوسال لگے۔امام بیضاوی نے بھی سفینہ سازی کی مدت دوسال بیان کی ہے۔امام بغوی نے دوسرا قول دیا کہ لکڑی چھیلنے میں ۴۰ سال اور خشک کرنے میں ۴۰ سال لگے؛ تیسری روایت حضرت کعب احبار کی ہے کہ ۳۰ سال میں جہاز بنایا گیا۔امام بغوی نے امام قرطبی کے حوالہ سے حضرت زید ابن اسلمؒ کی روایت بھی نقل کی ہے کہ ۱۰۰ سال لکڑی چھیلنے میں اور ۱۰۰ سال سفینہ بنانے میں لگے۔اسی روایت کو امام پانی پتی نے نقل کیا کہ حضرت نوحؑ ۱۰۰ برس تک درخت بوتے اور کاٹتے رہے پھر ۱۰۰ برس تک کشتی بناتے رہے۔ابن کثیر نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ہماری تعلیم کے مطابق ایک کشتی تیار کرو۔لکڑیاں کاٹ کر تختے بنالو جو ساگوان کے تھے۔اس میں ۱۰۰ سال لگے۔سفینہ مکمل بننے میں مزید ۱۰۰ سال لگے۔

گیارھویں صدی عیسوی کے فرانسیسی یہودی شارح توراۃ و تلمود ربی شلومو یتسحا کی (Rashi_Rabbi Shlomo Yitzhaki)۔مخفف رش ی = رَشی۔(۱۰۴۰-۱۱۰۵ء) نے سفینہ کی تعمیر کی مدت ۱۲۰ سال قرار دی ہے۔

قرآن حکیم میں بے شک سفینہ کا واضح ذکر آیا ہے مگر اس کی پیمائش اور ساخت کے بارہ میں کچھ نہیں کہا گیا، نہ احادیث میں تفصیلات ہیں۔حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہ نے جو کچھ کہا وہ فقط توراۃ اور اسرائیلیاتی روایات کی بلاتبصرہ نقل ہے یا یہ باتیں کسی نے غلط طور پر ان سے منسوب کردیں۔ان کے زمانہ میں یہ تفصیلات توراۃ کی کتاب تکوین کے علاوہ اور کہیں موجود نہیں تھیں۔ مدینہ منورہ میں اسلام سے پہلے انصار کے لوگ اور بعد میں کچھ صحابہ کبھی کبھی یہودیوں کے دینی مذاکروں میں شرکت کرتے تھے جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔بنی اسرائیل کے

مسلم علماء بھی یہ روایات نقل کر دیتے تھے۔ایسی روایات کو بعض ان معاملات میں نقل کر دیا جاتا تھا جن کا عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ان سے کوئی دینی یا دنیوی فائدہ یا نقصان بھی۔اسی لیے سفینہ کے بارے میں یہ روایات مفسرین نے یکجا کر دیں کہ اس موضوع پر مختلف بیانات کا تجزیہ کر کے منطقی نتائج اخذ کر لیا جائے یا انہیں رد کر دیا جائے۔

سفینہ کے متعلق یہ تمام روایات سورہ ھود کی تفسیروں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ان کا لب لباب یہ ہے کہ سفینۂ نوح کی تعمیر میں کم سے کم دو سال کا وقت لگا تھا، زیادہ سے زیادہ ۳۰۰ سال کا، اور اوسطاً ۱۰۰ سال کا۔ان تمام اعداد کا اوسط ۱۰۹ سال بنتا ہے۔اس پر دو سوال قائم ہوتے ہیں۔

پہلا سوال یہ کہ کیا بائبل کی پیمائش (300x50x30 ذراع) کی کشتی بنانے میں ۱۰۰ سال لگ سکتے ہیں؟ اور کیا اس کے لیے لکڑی چھیلنے، کاٹنے اور خشک کرنے کے مزید ۱۰۰ سال کی مدت مناسب ہے؟

دوسرا سوال یہ کہ جو سفینہ ۳۰۰ سال یا ۱۰۰ سال میں تیار ہوا اسے اپنی اصل ساخت میں کتنا بڑا ہونا چاہیے؟

بیان کے دو اسلوب: بائبل کے یہودی اور مختلف مسیحی فرقوں کے نسخوں میں حضرت نوحؑ کو حکم دیا جاتا ہے کہ ایک سفینہ بناؤ جس میں کوٹھریاں تیار کرنا اور اس (سفینہ) میں اندر اور باہر رال کا لیپ کرنا۔اس کے بعد اس کی لکڑی کی قسم، پیمائش، روشن دان اور عرض میں دروازہ، اس کے مسافروں اور ان سب کی غذاؤں کی رسد کا ذکر آ جاتا ہے (تکوین ۶: ۱۴-۲۲)۔قرآن حکیم میں اسلوب مختلف ہے۔وَ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ بِاَعۡیُنِنَا (ھود ۱۱: ۳۷) اور بنا کشتی روبرو ہمارے (مولانا شبیر احمد عثمانی، تفسیر عثمانی ۲: ۱۳۶)۔امام بغوی (معالم التنزیل ۴: ۱۷۳) نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ بِاَعۡیُنِنَا سے مراد ہماری طرف سے مہیا کی جانے والی نگرانی میں (بمرأی منا)۔امام قرطبی (احکام القرآن ۹: ۲۹) نے حضرت ابن عباسؓ ہی سے اس لفظ کا مطلب "ہماری نگرانی میں (بِحِرَاسَتِنا) بیان کیا ہے اور ضحاک اور سفیان نے اس کا معنی "ہمارے حکم سے" (بِاَمۡرِنا) بتایا ہے۔مفسرین نے ملائکہ کی مدد اور نگرانی کا ذکر بھی کیا ہے۔ایک نبی کو اس قسم کی سماوی مدد حاصل ہونا غیر ممکن یا تعجب و اعتراض کا محل نہیں۔یہی لفظ قرآن حکیم میں سورۃ القمر (۵۴: ۱۴) میں بھی استعمال ہوا ہے: تَجۡرِی

بِأَعيُنِنَا کشتی۔ جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی۔ امام بیضاوی (انوار التنزیل ۵:۲۶۶) نے لکھا ہے ہماری نگاہوں کے سامنے، ہماری حفاظت میں۔ مولانا جلال الدین سیوطی (جلالین ۶:۲۱۶) نے بھی بالکل یہی معنی لکھے ہیں۔

امام اندلسی (بحر المحیط ۵:۲۲۱) نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نوحؑ نہیں جانتے تھے سفینہ کیسے بنایا جائے تو انہوں نے کہا، میں تو بڑھئی نہیں ہوں۔ اس پر اللہ نے وحی بھیجی کہ پرندہ کے پیٹ کی مانند بناؤ۔ یہ بدیہی بات ہے کہ دنیا میں ہر کام اللہ کی نگرانی اور آنکھوں کے سامنے ہی ہوتا ہے۔ اس لیے بات صرف فرشتوں کی عملی مدد تک نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ مصحفہ اخنوخ میں حضرت نوحؑ کے پردادا حضرت ادریسؑ کے زمانہ میں اس قوم کے بحری جہازوں کا ذکر آچکا ہے جو سمندروں میں چلتے تھے۔ گویا اس زمانہ میں نہ تو جہاز سازی کی صنعت کوئی عجوبہ تھی اور نہ یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرت نوحؑ یا ان کی قوم اس شے اور اس فن سے قطعاً لاعلم تھی۔

حساس آلۂ پیمائش کا انکشاف: بِأَعيُنِنَا کی تفسیر میں امام بیضاوی (انوار التنزیل ۳:۲۳۳) نے ایک بڑا حیرت انگیز انکشاف کیا ہے۔ ملتبسا **بِأَعيُنِنَا عبر بکثرة آلة الحس الذی یحفظ به شیء و یراعی عن الاختلال و الزَیغ عن المبالغه فی حفظ الرعایة علی طریق التمثیل** "ہر جزو کی حفاظت (رکارڈ) کرنے والے اور نقشہ کی مطابقت کرنے والے ایک حساس آلہ کے ذریعہ کوئی بھی اختلال (کمی بیشی) اور زیغ (ٹیڑھ، شک وشبہ) کچھ بھی ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہے گا"۔ اس عبارت کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بِأَعيُنِنَا سے مراد ہے کہ ایک ایسے حساس آلہ کا کثرت سے استعمال جو ہر شے کا رکارڈ رکھے (**یحفظ به** حفاظت کرے) اور کسی بھی اختلال (اونچ نیچ) اور زَیغ (ٹیڑھ میڑھ یا شک وشبہ) کی نگرانی کرے تاکہ تختی پر اتارے ہوئے نقشے کے مطابق (سفینہ کی ساخت میں کوئی) مبالغہ (اضافہ) نہ ہوجائے۔

یہ حساس آلہ کیا تھا؟

موجودہ زمانہ میں نہایت حساس آلہ کون سا ہے؟ کیا اس سے کوئی ایسا حسابی آلہ مراد ہے جو ایک ایسے سفینہ کی ساخت میں استعمال کیا جارہا ہو جسے ایک بہت شدید اور متلاطم طوفان میں کئی ماہ تک خشکی کے قریب سے گزرے بغیر سفر کرنا تھا۔

ایک لفظ میں: کیا اس زمانہ میں سلیکون کی چپی بنائی جا چکی تھی؟

کیا اس قوم کے پاس کمپیوٹر قسم کے آلات الحساب تھے؟

آلتہ الحس کے جیسا یہ اکیلا ایسا بیان نہیں ہے۔ دیگر بیانات سے پہلے امام بیضاوی کے اس بیان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ:

سفینہ سازی سے پہلے جہاز کا مکمل نقشہ ایک تختی پر بنایا گیا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سارا کام الل ٹپ نہیں ہو گیا تھا بلکہ ماہر انجینئروں نے پہلے اس کا نقشہ بنایا تھا۔

اس نقشہ کے مطابق جہاز کی تعمیر کا کام شروع ہوا تھا۔

یہ ضمانت حاصل کرنے کے لیے کہ جہاز کی تعمیر میں نقشہ کی پیمائشوں سے بال برابر بھی فرق نہ آئے ایک نہایت حساس آلہ کے ذریعہ ہر طرح کے سامان کی متواتر اور کثرت سے بار بار (بکثرۃ) پیمائشیں کی جارہی تھیں، چوبی، آہنی اور دیگر دھاتوں کے تختوں، پٹیوں کی تراش خراش، چھیلنے، کاٹنے، جوڑنے کا کام نفاست اور باریکی سے کیا جارہا تھا کہ کسی بھی جگہ نہ تو ذرہ برابر کمی بیشی ہو، نہ ٹیڑھ میڑھ آئے، اور نہ نقشہ کے خلاف کوئی کام ہو۔ اور جہاز کے ایک ایک باریک سے باریک جزو کی پیمائشیں اس حساس آلہ میں رکارڈ اور محفوظ تھیں۔

فولاد سے تختوں کی مضبوطی: سورہ ھود کی تفسیر میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی (تفسیر مظہری ۶:۲۸-۲۹) نے لکھا ہے کہ کشتی بنانے کے لیے حضرت نوح ''تختے چیرنے اور لوہا لگانے اور کشتی کے لیے ضروری سامان کی تیاری کرنے لگے مثلاً تارکول یا روغن قیر'' ملنے لگے۔ مزید حضرت ابن عباسؓ کا قول دیا ہے کہ لکڑی کے تختوں کو فولادی کیلوں سے مضبوط کیا گیا۔ امام بغوی (معالم التنزیل ۴:۱۷۴) نے کہا کہ سفینہ بنانے کے لیے لکڑی کے تختے کاٹے گئے اور ان پر فولاد کی چادریں چڑھائی گئیں یا انہیں فولادی کیلوں سے جوڑا گیا تھا۔ (**جعل يقطع الخشب و يضرب الحديد**)۔ امام قرطبی (الجامع لاحکام القرآن ۹:۴۴) نے میخوں کے لیے واضح طور پر فولاد کا لفظ استعمال کیا ہے: وشدھا بدُسُر، یعنی مسامیر الحدید اور اسے مضبوط کیا دُسُر سے، یعنی لوہے کی کیلوں سے۔ ابن کثیر (ر: تفسیر ۱۲: ۵۹۹-۶۰۱) کا بیان ہے کہ جہاز کے عقبی حصہ میں پانی کاٹنے کے پر پرزے پتوار بھی لگائے گئے تھے۔ ایک ایسے جہاز میں جو وسیع و عریض بھی ہو اور جسے بغیر رکے کئی ماہ کی مدت تک سفر کرنا ہو، لکڑی کے

پرزوں سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ عمدہ اور طویل مدتی کارکردگی کے لیے ضروری تھا کہ وہ پتوار ایسی مرکب دھات کے تھے جس پر مسلسل پانی میں رہنے کے باوجود زنگ نہ آئے۔

بائبل کی تصریحات میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ سفینہ کے عرض میں ایک دروازہ کے علاوہ چپو چلانے کے چھوٹے گول دریچے بنانے کی ہدایت دی گئی ہو۔ یوں بھی جہاز میں مسافروں کی تعداد محدود تھی تو طویل سفر کے دوران ہر کام کے لیے، بالخصوص چپوؤں سے کشتی کو کھینے کے لیے، ضروری افرادی طاقت مہیا نہیں تھی۔ اس سے ایک خیال یہ ہوسکتا ہے کہ کشتی کو بس اللہ کے بھروسے پانی کے بہاؤ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ مگر یہ خیال غیر معقول ہے۔ کشتی بنانے کے حکم کا تعلق اسباب مہیا کرنے سے تھا۔ چنانچہ یہ باور کرنا سہل ہے کہ دوران سفر پانی کاٹنے کے پر پرزے اور آلات سب خودکار تھے جن کو کئی ماہ تک ۲۴ گھنٹہ بلا رکے چلتے رہنا تھا۔ اس لیے ان آلات کا بھی دھاتی ہونا لازمی تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں ایک طرف لوگوں کو یہ یقین واثق ہے کہ موجودہ یورپ اساس تہذیب سے زیادہ بڑی، زیادہ ترقی یافتہ تہذیب دنیا میں کبھی نہیں ہوئی وہاں بائبل کے شارحین اپنی شرحوں میں سفینہ نوح کی تعمیر کی دستی تصاویر میں جدید طرز کی کلوں یا مرفاع یا غرنوقہ (کرین crane) کا استعمال ہوتے بھی دکھاتے ہیں۔ بات یہ نہیں کہ انہیں مصور کی بصری تمثال نگاری کہہ کر نظر انداز کردیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ آج کا مصور بھی فطرتاً یقین رکھتا ہے کہ سفینہ نوح ۳۰ ذراع ہی بلند سہی اس کے بالائی حصوں کی تعمیر کے لیے غرنوقہ جیسی کلوں کا استعمال ضروری تھا اور محض افرادی قوت سے کام نہیں بن سکتا تھا، جبکہ بائبل میں صرف سات یا آٹھ افراد ہی حضرت نوحؑ کے ساتھی اور جہاز بنانے والے بیان کیے جاتے ہیں۔

عہد نوحؑ میں دھاتوں کا استعمال: منتشر روایات اور بیانات سے قطعیت کے ساتھ یہ تو معلوم ہوجاتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے زمانہ میں مختلف دھاتوں کا استعمال عام تھا۔ آثاریوں کا خیال ہے کہ کانسہ ۳۲۰۰ قبل مسیح میں دریافت ہوا تھا (۵۲۰۰ سال پہلے) اور لوہے کے زمانہ کا نقطۂ آغاز ۱۲۰۰ قبل مسیح (۳۲۰۰ سال پہلے) تھا۔ ظاہر ہے یہ حضرت نوحؑ سے بہت بعد کا زمانہ ہے۔ ان مورخانہ مزعومات کی جو بھی حیثیت ہو حضرت نوحؑ کے زمانہ سے پہلے لوہے کے استعمال کی خبر اوپر دی جاچکی ہے کہ حضرت آدمؑ نے ہی لوہا دریافت کرلیا تھا اور زراعت اور چرخے میں

اس کا آلاتی استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔ مصحفہ اخنوخ کی رو سے بنی قابیل لوہے کا استعمال جانتے تھے، حضرت ادریسؑ نے لوہے سے کپڑے سینے کی سوئی اور تلوار ایجاد کی تھی، اور حضرت شیث نے زراعت کے لئے ہل ایجاد کیا تھا۔ تلوار کے استعمال کا ذکر مصحفہ ۴۹:۷ میں آتا ہے۔ تلوار اور سوئی کا مطلب ہے کہ کم از کم حضرت ادریسؑ نے مرکب دھاتیں بنانے کا راز دریافت کرلیا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس زمانہ میں کئی اور دھاتوں کا ذکر بھی آتا ہے مثلاً سونا چاندی وغیرہ۔ اس کے علاوہ روایت ہے کہ حضرت نوحؑ کے زمانہ میں مشرکین پیتل، سونے اور چاندی کے بت بنایا کرتے تھے (مولانا محمد مالک کاندھلوی/ معارف القرآن ۸:۲۵۵)۔ امام بغوی (معالم التنزیل ۸:۲۳۳) نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ طوفان نوح میں یہ بت زمین میں دھنس گئے تھے جن کو شیطان نے نکالا اور مشرکین عرب کو دیا تھا۔ ان میں سے یغوث جرف میں بنی غطیف کا بت تھا۔ امام قرطبی (الجامع لاحکام القرآن ۱۸:۳۰۹) اور ابوحیان اندلسی (بحر المحیط ۸:۳۳۵) نے ابوعثمان الہندی کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے خود دیکھا کہ قوم نوح کا یغوث نامی بت شیر کی شکل کا سیسہ (رصاص) کا بنا ہوا تھا۔ امام قرطبی (احکام القرآن ۱۸: ۳۰۷) نے بیان کیا ہے کہ حضرت نوحؑ کے زمانہ سے پہلے ہی ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کے بت پیتل یا کانسے اور سیسہ کی مرکب دھات سے بنا کر احتراماً معبد میں رکھ دیے گئے تھے۔ بعد میں ان بتوں کو خدائی کا درجہ دے کر ان کی پرستش شروع ہوگئی۔ سیسہ سے تیروں کے پھل بھی بنائے جاتے تھے۔

کیلوں سے سِلائی کی ایجاد: مفسرین کی دی ہوئی یہ اطلاع شائد ذہن میں حرکت پیدا نہ کرے کہ سفینہ کے لکڑی کے تختوں کو فولادی کیلوں سے مضبوط کیا گیا تھا۔ تاہم امام بیضاوی کی طرح امام اندلسی نے بھی اس سلسلہ میں ایک اور اہم انکشاف کیا ہے۔ تفسیر بحر المحیط (۸:۱۷۰) میں سورہ القمر (۵۴:۱۳) کی تفسیر میں پہلے تو یہ بتایا کہ دُسُر مسامیر (کیلوں، میخوں) کو کہتے ہیں جن سے سفینہ کو مضبوط کیا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ سفینہ کے تختوں میں کیلیں اس طرح لگائیں جیسے ان تختوں کی سلائی کی گئی ہو۔ امام ابوحیان اندلسی کی وفات ۷۴۵ھ/ ۱۳۴۴ء میں ہوئی تھی جب نئی دنیا میں فولاد، پیتل اور دیگر مرکب دھاتوں کے بنے ہوئے بحری

اور ہوائی جہازوں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ سات صدی پہلے کے متذکرہ بالا انکشاف میں حیرت کا عنصر اکیسویں صدی کا ایک مشاہدہ پیدا کرتا ہے۔ جن لوگوں نے موجودہ دور کے جنگی بحری جہازوں کی بیرونی سطح کو قریب سے دیکھا ہے یا ہوائی سفر کے دوران طیارہ کے پنکھوں کی ساخت پر غور کیا ہے یا دریاؤں پر بنے ہوئے فولادی پلوں کے دھاتی شہتیروں پر نظر کی ہے تو امام اندلسی کا قول پڑھ کر ان کو یاد آئے گا آج کے بحری اور ہوائی جہازوں اور دریائی پلوں میں دھاتی چادروں اور شہتیروں کو باہم جوڑنے کے لیے کیلوں اور میخوں (دسر) کا استعمال کیا جاتا ہے جن کے درمیان یکساں فاصلہ ہوتا ہے اور بیک نظر ایسا لگتا ہے جیسے ان کی سلائی کی گئی ہو۔

بادی النظر میں ان کو آج کی سائنس کی دین کہا جائے گا۔ مگر یہاں ثابت ہوتا ہے کہ حقیقتاً موٹی دھاتی چادروں یا لکڑی کے تختوں کو یوں مضبوطی سے جوڑنے کے اس طرز تعمیر کے موجد حضرت نوحؑ تھے، ان کے زمانہ میں بحری مواصلات کے مہندسین یا تو اس طرز کے موجد تھے یا اس فن تعمیر سے بخوبی واقف تھے۔ امام اندلسی (بحر المحیط ۵:۲۲۲) نے یہ بھی کہا ہے کہ سفینہ بنانے کے لیے حضرت نوحؑ نے کچھ لوگوں کو ملازم رکھا تھا جو ان کی مدد کرتے تھے، نیز ان کے تین بیٹے سام، حام اور یافث بھی ان کے ساتھ کام کررہے تھے۔ مولانا مفتی شفیع (معارف القرآن ۴:۶۱۸) کا بھی یہی خیال ہے کہ حضرت نوحؑ کشتی تیار کرنے لگے ”خواہ خود یا دوسرے کاریگروں کے ذریعہ سے“۔ یہاں اس نکتہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ سفینہ کے اصل معمار یا مہندس انجینئر نقشہ کش خود حضرت نوحؑ تھے اور مختلف کاموں کے لیے انھوں نے لوگوں کو اپنی ماتحتی میں رکھ لیا تھا۔ حضرت نوحؑ کے زمانہ میں اگر لوگوں کو یہ پتا ہی نہیں تھا کہ کشتی کیا ہوتی ہے، کیسے بنتی ہے تو اس فن کے کاری گر کہاں سے آتے۔

(باقی)

قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے

جناب غلام نبی کشافی

(۲)

علم ریاضی میں جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے وہ ہے 'صفر' (Zero)۔ چنانچہ اس 'صفر' کے حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کا تصور سب سے پہلے ہندوستان میں پیش کیا گیا اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ہندوستانی گنتی پہلے ہندوستان سے اسپین میں داخل ہوئی۔ پھر وہ اٹلی، فرانس، انگلینڈ اور جرمنی پہنچی۔ اس طرح اس کو مغرب میں قبول عام حاصل ہوا۔ جبکہ بعض محققین کا دعویٰ ہے کہ صفر کا ابتدائی تصور ابتدائے ہندوستان کا تو ہے، مگر یہ صحیح نہیں کہ وہ ہندوستان سے براہ راست مغربی دنیا میں پہنچا، بلکہ یہ عربوں کے ذریعے مغربی دنیا میں پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں اس کو ہندوستانی گنتی کے بجائے عربی گنتی (Arabic numerals) کہا گیا۔ (دیکھیے اسلام دور جدید کا خالق از مولانا وحیدالدین خان، ص: ۸۲۔۸۳)

لیکن مصنف کتاب کا کہنا ہے کہ ریاضی میں صفر کا کارنامہ مسلمانوں کا ہے، اور انہوں نے ہی سب سے پہلے اس کی ایجاد کی۔ انھوں نے چند مغربی محققین کی تصانیف سے کئی اقتباسات دے کر لکھا ہے کہ فرنچ اور انگریزی Zero کا عربی لفظ صفر سے ماخوذ ہے جو 'خالی' کے معنی میں آتا ہے۔ صفر کے لیے آج تک عربی میں نقط (dot) استعمال ہوتا آیا ہے۔ مسلمانوں کا قدیم ترین معلوم مخطوطہ، جس میں صفر کا استعمال ہوا ہے، ۸۷۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ ہندوؤں کا قدیم ترین صفر گوالیار کے ایک کتبے میں ملتا ہے جو ۸۷۶ء کا ہے۔

آنچار (صورہ) سرینگر کشمیر ۱۹۰۰۱۱۔

اس شبہ کا بھی ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عددی نظام کو مسلمانوں کے یہاں ہندی اعداد کیوں کہا جاتا ہے؟ لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں نے جو عددی نظام یورپ میں رائج کیا اسے مغرب والے Arabic numerals کہتے ہیں مگر خود مسلمانوں کے یہاں انہیں ہندی اعداد کہا گیا ہے۔ اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ یہ اعداد ہندی الاصل ہیں اس لیے انھیں Indian Numerals بھی کہا جاتا ہے۔ مگر اعداد کا انداز ترقیم اس نظام کے عربی الاصل ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ مثلاً ۴۲۵ تین عددوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ۵، اکائیاں ۲، دہائیاں اور ۴، سیکڑے ہیں۔ عربی ترتیب میں دائیں سے بائیں یوں لکھا جائے گا۔
>
> | اکائی | | دہائی | | سیکڑہ | |
> |---|---|---|---|---|---|
> | ۵ | | ۲ | | ۴ | |
> | ۵ | + | ۲۰ | + | ۴۰۰ | =۴۲۵ |
>
> اب اگر سنسکرت میں اسے لکھا جائے تو ترتیب بائیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس لیے ۴۲۵ کو یوں لکھ جائے گا۔
>
> | سیکڑہ | | دہائی | | اکائی |
> |---|---|---|---|---|
> | ۴ | | ۲ | | ۵ |
> | =۵۲۴ ۴۰۰ | + | ۲۰ | + | ۵ |
>
> اس سے لگتا ہے کہ گنتی کا مروجہ طریقہ سنسکرت کے طرز ترتیب سے میل نہیں کھاتا، اس لیے اسے ہندوستانیوں کی ایجاد قرار دینا محل نظر ہے۔ کارداوو بھی اس عددی نظام کو ہندی الاصل ماننے میں متامل ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ''ہندی'' لفظ اور 'ہندسی' کے درمیان عربی طرز تحریر میں اشتباہ ہوتا ہے۔ عرب جیومیٹری کو ہندسہ کہتے ہیں اس لیے ہندسی کے معنی ہیں ''جیومیٹری سے متعلق''۔ (ص: ۲۱۴۔۲۱۵)

''علم الہندسہ'' کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

''علم الہندسہ ریاضیات کے اس علم کا عربی نام ہے جسے ہم جیومیٹری (Geometry) کہتے ہیں۔ یہ لفظ فارسی مصدر ''انداختن'' یا ''اندازیدن'' سے مشتق ہے۔ انداختن کے معنی ہیں پھینکنا یا کسی چیز کو ناپنا، اندازہ اس کا حاصل مصدر ہے۔ جو قد، ناپ، قیمت یا تخمینہ کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ اہل فارس کے یہاں یہ لفظ جیومیٹری کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ علم الہندسہ کا یونانی نام جیومٹری ہے۔ عرب مصنّفین نے اپنی کتابوں میں 'جومطریہ' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو یونانی نام کی معرب صورت ہے۔ علم الہندسہ کے ماہر کو عربی میں مہندس کہتے ہیں جس کے لیے انگریزی میں Geometer کا لفظ مستعمل ہے''۔ (ص:۲۳۴۔۲۳۵)

مغربی دانشور ڈریپر کا بیان بھی نقل کیا گیا ہے جس میں وہ مسلمانوں کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مسلمانوں نے قدیم علوم وفنون میں بہت اضافے کیے اور بہت سے نئے علوم ایجاد کیے۔ انھوں نے حساب کا ہندی طریقہ رائج کیا جو زبردست ایجاد تھی۔ اس میں تمام عددوں کو دس علامتوں سے ظاہر کیا تھا۔ ان علامتوں میں سے ہر عدد کی مطلق اور مقامی قیمت متعین ہوتی تھی۔ اس سے حساب وکتاب کے آسان اور سادہ قاعدے وضع ہوئے''۔ (ص:۲۵۹)

بلاشبہ علم ریاضی میں عددی علامتوں، خاص طور پر 'صفر' (Zero) کی دریافت انقلابی نوعیت کی تھی۔ اگرچہ بعض مخالفین یا متعصب محققین نے اس دریافت کو ایک نامعلوم ہندوستانی کے ذہن کی پیداوار بتایا ہے۔ اسلام کے آنے کے بعد علم وآگہی کی دنیا میں ایک زبردست انقلاب آ گیا جو سائنسی انکشافات وایجادات معرضِ وجود میں آئے۔ وہ سب مسلمان سائنس دانوں کے کارنامے ہیں۔ لیکن افسوس کہ موجودہ دور کے مسلم علماء نے اپنے اسلاف کی علمی میراث سے عدم دلچسپی کی وجہ سے اپنے حال اور مستقبل کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے علمی میراث کے حقیقی وارث بنیں۔

دسواں عنوان: ''طب''(Medicine) کا ہے۔قرآن وحدیث میں طب اورحفظان صحت کے متعلق واضح تعلیمات موجود ہیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اس باب میں جتنی اہم اور بنیادی باتیں بیان ہوئی ہیں۔دنیا کے کسی بھی مذہب میں اتنی واضح رہنمائی نہیں ملتی۔قرآن میں اصولی باتیں ہیں تو احادیث نبوی میں تفصیلات ہیں۔بیشتر کتب حدیث میں کتاب الطب کا عنوان ضرور ملتا ہے۔مشہور عالم ومحقق علامہ ابن القیم (۶۹۱ھ۔۷۵۱ھ) نے ایک مفصل کتاب ''الطب النبوی'' کے نام سے لکھی ہے۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں طب اور حفظان صحت کی کیا اہمیت ہے؟ بعد کے ادوار میں مسلمانوں میں یونانی طب کا رواج حکمائے یونان کی ان کتابوں سے ہوا جو یونانی یا سریانی زبان میں عربی میں ترجمہ کی گئیں،مثلاً جالینوس کی کتابوں کے ایک سو(۱۰۰) سریانی اور انتالیس(۳۹) عربی ترجمے کیے گئے۔اس طب کے فروغ کے سلسلہ میں قرآن اوراحادیث نبوی سے بھی بھرپور استفادہ کیا گیا۔مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''طب اورسائنس کا زریں دور مسلمانوں کی عبقریت کے اظہار کا دور تھا۔عیسائی اورصابی اطباء، میں سے بعض اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئے۔جن میں علی بن ابن سہل مشہور ہیں۔انھوں نے فردوس الحکمۃ کے عنوان سے عربی میں ایک کتاب لکھی جس کا شمار طب کی قدیم ترین کتابوں میں ہوتا ہے''۔(ص:۲۶۷)

مزید تحریر کرتے ہیں:

> ''ابوبکر محمد بن زکریا الرازی جنہیں یورپ میں AbubacerRhazes کہا جاتا ہے،ایران کے شہر''رے'' کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ افلاس کی وجہ سے معمولی تعلیم حاصل کرسکے اور پھر ان کا وقت عود بجانے اوراپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے میں کٹتا رہا۔پیسہ کمانے کا خیال آیا مگر کام نہیں تھا۔سونا بنانے کے چکر میں علم کیمیاء کی طرف توجہ دی اور گھر میں بھٹی بنا کر تجربات شروع کردیے۔جس سے ان کی آنکھیں خراب ہوگئیں۔ایک طبیب سے رجوع کیا،اس نے سونے کی پانچ سو اشرفیاں معاوضے میں طلب کیں۔رازی نے کہیں سے رقم کا بندوبست کیا اورآنکھوں کا علاج کرایا۔صحت یابی کے بعد طبیب نے

کہا کہ تم خواہ مخواہ سونا بنانے کے چکر میں پڑ کر اپنی آنکھیں خراب کر بیٹھے۔ اصل اکسیر تو انسان کا ہنر ہے، مجھے دیکھو پانچ سو اشرفیاں آپ سے کمائیں اور آپ بھی ٹھیک ہو گئے۔ ڈاکٹر کی یہ بات رازی کے دل میں اتر گئی۔ چنانچہ انھوں نے طب کا علم حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ ۳۸ سال کی عمر میں بیوی بچوں کو چھوڑ کر بغداد کی راہ لی اور وہاں جا کر طب کی تعلیم حاصل کرنے میں لگ گئے۔ وہاں وہ اپنے استاد کے ساتھ روزانہ ہسپتال جا کر عملی طب میں تجربات کرتے تھے۔ انھیں تجربوں سے وہ ایک ماہر اور حاذق طبیب بن گئے''۔ (ص:۲۶۹)

رازی کی تصانیف کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ فرانس کے بادشاہ لوئیس یازدہم (دور بادشاہت ۱۴۶۱ء۔ ۱۴۸۳ء) کو رازی کی کچھ کتابوں کی ضرورت پڑی تو اس نے پیرس کی یونیورسٹی سے رجوع کیا، ایک امیر ضامن بنا اور بہت بڑی رقم جمع کرائی تب یونیورسٹی والوں نے رازی کی چند کتابیں مستعار دیں۔ (ص: ۲۷۴)

بغداد اور دوسرے شہروں میں سینکڑوں مسلم اطباء نے ناموری پائی اور اعلیٰ درجے کی طبی تصنیفات یادگار چھوڑیں۔ ان میں ایک کتاب کامل الصناعۃ یورپ میں بے حد مقبول ہوئی۔ یہ کتاب عام طور پر کتاب الملکی کے نام سے معروف ہے۔ اس کے مصنف طبیب علی بن عباس (المتوفی ۳۸۴ھ) ہیں، جو یورپ میں ہیلی عباس Haly Abbas کے نام سے مشہور ہیں قابل غور بات یہ ہے کہ علی بن عباس نے اپنی کتاب میں ذات الصدر اور علم الجنین کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ آج بھی درست ہیں۔ زہر اور اس کے اثرات و تریاق پر بھی ان کی تحقیقات علم سموم میں اہم ہیں۔ (ص: ۲۷۵) اسی طرح ابن سینا (۳۷۰ھ۔ ۴۲۸ھ) کی تصنیفات مشرق و مغرب میں مقبول ہوئیں۔ مغرب میں ان کی کتابیں پڑھنے کے لیے عربی زبان سیکھی گئی۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''القانون فی الطب'' ہے۔ جو چودہ جلدوں اور پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ اصول طب، ادویہ مفردہ، اعضائے خاصہ، امراض عامہ اور ادویہ مرکبہ یہ پانچ حصے ہیں۔ کتاب میں کم و بیش دس لاکھ الفاظ ہیں۔ یہ مشرق اور مغرب میں صدیوں تک طب کی اساس بنی رہی۔ (ص: ۲۷۷)

طب کی تاریخ میں القانون کو جو غیر معمولی پذیرائی ملی، اس کا اعتراف یورپی اور امریکی

ماخذوں میں اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ بہ آسانی ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے۔(ص:۲۷۸)

اس طرح القانون کی لافانی شہرت نے ابن سینا کو عزت واحترام کے اس مقام پر لا کھڑا کیا، جہاں صرف بقراط اور جالینوس ان کے ہم دوش وہم سر نظر آتے ہیں۔(ص:۲۸۰)

ابن النفیس بھی علم طب کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں۔ان کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ تحقیق پسند تھے۔اپنی مشہور تصنیف ''شرح تشریح القانون'' میں انھوں نے طبی نظریات کو قلم بند کیا ہے۔لکھا گیا کہ:

> ''مغرب میں دوران خون کا نظریہ سب سے پہلے سولھویں صدی میں مائیکل سرفیٹس نے پیش کیا، ان کی کتاب ۱۵۵۳ء میں شائع ہوئی، ان کے علاوہ ریلڈ وکولمبو Realdus Columbus نے بھی اس سے ملتی جلتی تھیوری بیان کی۔ ان کی کتاب ۱۵۵۹ء میں چھپ گئی۔مگر اب پتہ چلا ہے کہ دوران خون کی دریافت اصل میں ابن النفیس کا کارنامہ ہے۔جنھوں نے دوران خون کے متعلق صحیح نظریہ اپنی کتاب ''شرح تشریح القانون'' میں بیان کیا ہے''۔(ص:۲۸۷)

یہاں یہ سوال بھی سامنے آیا کہ:

> ''ابن النفیس نے دوران خون کے متعلق اپنا نظریہ ۶۴۱ھ/ ۱۲۴۲ء میں بیان کیا ہے۔ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا سرفیٹس اور کولمبو ابن النفیس کی دریافت سے واقف تھے یا نہیں؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لاطینی مغرب میں ابن النفیس کا نظریہ بلونو کے ایک فاضل اندریا الپاگو Andrea Alphgo (المتوفی۔۱۵۲۰ء) کو معلوم تھا اور اغلب ہے کہ لاطینی مغرب میں اسی نے یہ نظریہ پہنچایا ہو، اندریا الپاگو نے شام میں عربی مسودات تلاش کرنے میں تیس سال گزارے، انھوں نے عربی کی متعدد طبی تصانیف کا ترجمہ لاطینی میں کیا، جن میں ''شرح تشریح القانون'' کا وہ حصہ بھی شامل ہے جو مرکب ادویات کے بارے میں ہے۔اندریا الپاگو نے اس حصے کے لاطینی ترجمے میں دل اور شریان کے متعلق جالینوس کے خیالات کا ذکر کیا ہے اور پھر ان پر ابن النفیس کی تنقید نقل کی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ الپا گو، ابن النفیس کے نظریے سے بخوبی آ گاہ تھے اور انھیں کی زبانی یا غیر مطبوعہ تحریروں کے ذریعے اہل مغرب تک ابن النفیس کا نظریہ پہنچا ہے''۔(ص:۲۸۷۔۲۸۸)

مزید تحریر کرتے ہیں:

''ابن النفیس کی دریافت صدیوں تک دنیا کی نظروں سے اوجھل رہی۔ رواں صدی کے وسط تک مغرب کے مستند علمی ماخذوں میں دوران خون کی دریافت کا سہرا مائیکل سرفیٹس اور ولیم ہاروے کے سر ہوتا تھا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد سے دنیا کے مختلف مستند علمی وطبی جرائد میں وقتاً فوقتاً بعض ایسے مضامین شائع ہونے لگے۔ جن میں دوران خون کی دریافت کو زیر بحث لایا گیا۔ یہ مضامین مغرب کی مختلف زبانوں میں تھے۔ ان میں سے بعض مضامین کی سرخیاں اس طرح تھیں۔

الف) ابن النفیس اور ان کا نظریہ دوران خون۔

ب) دوران خون کی تاریخ کا ایک فراموش شدہ باب۔

ج) کیا سرفیٹس ابن النفیس سے متاثر ہوئے تھے۔

د) مسئلہ دوران خون کے متعلق ابن النفیس کا لاطینی ترجمہ(۱۵۴۷ء)۔

ھ) ریوی دوران خون کی دریافت، ایک نیا زاویہ نگاہ۔

و) ابن النفیس، سرفیٹس اور کولمبو۔

محققین نے اس قسم کے اور بھی مضامین تحریر کیے۔ ان میں ابن النفیس سرفیٹس اور کولمبو کے رول کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ دوران خون کی دریافت پر یہ بحث علمی حلقوں میں برسوں جاری رہی۔ ۱۰/جون ۱۹۵۷ء کو لندن کی مشہور خبر رساں ایجنسی رائٹر نے ایک خبر شائع کی، جس میں یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی کہ دوران خون کا دریافت کرنے والا عہد وسطیٰ کا مسلم سائنس داں ابن النفیس تھا۔ اس کے بعد انسائیکلو پیڈیا میں دوران خون میں پھیپھڑوں کے کردار کے دریافت کنندہ کی حیثیت سے ابن النفیس کا نام شامل کیا گیا''۔(ص:۲۸۹)

اسی طرح امراض چشم کے متعلق ایک نام علی بن عیسیٰ کا نام آتا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ:

''مسلمانوں نے آنکھ کی بیماریوں کی طرف توجہ دی۔ امراض چشم کے ممتاز ماہرین میں پہلے علی بن عیسیٰ کا نام آتا ہے۔ جنہیں مغرب والے Jesu Haly کہتے ہیں۔ انھوں نے تذکرۃ الکحالین کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی جس میں آنکھ کی بیماریوں اوران کے علاج پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جارج سارٹن کا کہنا ہے کہ علی بن عیسیٰ نے اپنی اس کتاب میں ایک سوتیس (۱۳۰) امراض چشم اور ایک سو تینتالیس (۱۴۳) ادویات کا ذکر کیا ہے۔ ول دوران ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اس عظیم ترین کحال کی کتاب تذکرۃ الکحالین یورپ میں اٹھارھویں صدی تک مستند ترین تالیف کی حیثیت سے زیر استعمال رہی''۔

اسی طرح:

''امراض چشم کے سرکردہ ماہرین میں ابوالقاسم عمار بن علی الموصلی المعروف بہ عمار موصلی کا نام بھی مشہور ہے۔ انھیں یورپ میں Canamusali کہا جاتا ہے۔ جارج سارٹن نے انھیں امراض چشم کے مسلم ماہرین میں سب سے خلاق سائنس دان کہا ہے۔ انھوں نے کتاب المنتخب فی علاج العین تصنیف کی، جس میں آنکھ کی بیماریوں اوران کے علاج کے علاوہ موتیا بند کے لیے چھ آپریشنوں کا بیان ہے۔ ان میں خاص طور پر وہ آپریشن قابل ذکر ہے جس میں غیر متحجر موتیا بند کا پانی دھات کی ایک نلکی سے جو خود ان کی اپنی ایجاد تھی، کھینچ لینے کی وضاحت کی ہے''۔ (ص:۲۹۰)

طب کے فروغ میں مسلم خواتین کی خدمات کا ذکر بھی کیا کہ:

''طب اسلامی کے فروغ میں مسلم خواتین کا کردار بھی تاریخ طب کا روشن ورق ہے۔ عہد رسالت میں صحابیات میدان جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کا فریضہ انجام دیتی تھیں۔ حضرت ام سلیم، ام متاع، ام عطیہ اور لیلیٰ کو مرہم پٹی کرنے میں خاص مہارت تھی۔ حضرت ابوبکر کی صاحبزادی حضرت اسماء

علاج معالجے میں مشہور تھیں۔حضرت رفیدہ انصاریہ جراحی میں ماہر تھیں۔مسجد نبوی کے صحن میں ان کے لیے خیمہ نصب کیا گیا تھا۔جس میں جراحی کے آلات اور سامان رکھے گئے تھے۔خلافت بنی امیہ میں ایک خاتون طب بالخصوص امراض چشم کی ماہر تھیں۔اندلس میں حفید ابوبکر کی ہمشیرہ اور بھانجی کو طب میں خاص کر معالجہ نسوانی میں کمال حاصل تھا۔دونوں خلیفہ کے حرم میں علاج کیا کرتی تھیں۔اندلس ہی میں قاضی ابوجعفر کی بیٹی ام الحسن بہت اچھی طبیبہ تھیں۔مغل حکمران شاہجہاں کے عہد سلطنت میں ستی النساء کو علاج معالجے میں یدطولیٰ حاصل تھا۔قرطبہ میں عورتیں باقاعدہ مطب کیا کرتی تھیں۔قرون وسطیٰ کے بعض مسلم شفا خانوں میں نرسوں کو بھی تعینات کیا جاتا تھا''۔(ص:۲۹۱۔۲۹۲)

یونان کے ذخیرۂ ادویات میں سیکڑوں نئی دواؤں کا اضافہ کس طرح کیا گیا،ملاحظہ ہو:

''حکمائے اسلام نے ادویات کی طرف بھی توجہ دی اور یونان کے ذخیرۂ ادویات میں سیکڑوں نئی دواؤں کا اضافہ کیا۔انھوں نے چین، جزائر شرق الہند، ملایا اور ہندوستان سے جڑی بوٹیاں حاصل کر کے یونانی علم ادویہ کا دامن وسیع کیا۔ بیخ ریوند، کافور اور سنا کے افعال وخواص دریافت کیے اور علاج میں بھنگ کے استعمال کی ابتدا کی۔کیمیاوی مرکبات تیار کر کے انھیں طب میں استعمال کرنے کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر جاتا ہے۔علاوہ ازیں یہ مسلمان ہی تھے، جنھوں نے مرکب ادویہ کی تیاری میں سب سے پہلے شکر استعمال کیا،شکر سازی کے معمل تیار کیے اور شکر بنائی''۔(ص:۲۹۳)

یقیناً مسلم اطباء وحکماء کے کارہائے نمایاں تاریخ اسلام کا ایک سنہرا باب ہے۔لیکن سب سے بڑھ کر طب کے بارے میں جو بنیادی باتیں حضور اکرمؐ نے فرمائی ہیں وہ نہ صرف ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ان کو دیکھنے کے بعد یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ایسے جامع کلمات زبان نبوی ہی پر آسکتے ہیں۔یہاں صرف دو حدیثیں نقل کی جاتی ہے:

۱)عن أبی هريرة عن النبی ﷺ قال حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے

ما أنزل اللہ داءً الاّ انزل له شفاءًا۔ (البخاری کتاب الطب، باب ما انزل اللہ داءالاّانزل لہ شفاء، حدیث نمبر ۵۶۷۸)

فرمایا، اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری نہیں اتاری جس کی دوا بھی نازل نہ کی ہو۔

۲)عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ ﷺ ما أنزل اللہ من داءٍ الاّ وقد أنزل معه شفاءًا علمه من علمه وجهله من جهله۔ (المستدرک الحاکم، کتاب الطب، حدیث نمبر ۷۴۲۴)

حضرت عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کے ساتھ اس کا علاج بھی نازل کیا ہے، جس نے اس کو جانا، اس نے جانا اور جو اس سے بے خبر رہا، وہ اس سے بے خبر رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے یہ دونوں ارشادات طب میں رہنما اصول کی اہمیت رکھتے ہیں۔ خاص کر آج کے دور میں میڈیکل علوم میں غیر معمولی ترقی اور نئی نئی دواؤں اور علاج کے جدید ترین طریقوں کے تناظر میں اللہ کے رسولؐ کے ارشادات کی صداقت اور آپؐ کے نبی برحق ہونے پر ہمارے ایمان میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ ایک عالم نے مذکورہ آخرالذکر حدیث کے بارے میں یہ غور طلب بات لکھی ہے:

> ''پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد گویا قائد انقلاب کا ارشاد تھا، چنانچہ آپؐ نے اپنی زبان سے اس طبی حقیقت کا اعلان فرمایا اور دوسری طرف تاریخ عملی طور پر اس کے سانچہ میں ڈھلنا شروع ہوگئی۔ اسلامی انقلاب سے پہلے دنیا میں شرک اور توہم پرستی کا زور تھا۔ اس زمانہ کا ماحول اتنا غیر موافق تھا کہ کوئی شخص اگر علمی اور سائنسی تحقیق کرتا تو اس کو لوگوں کی طرف سے حوصلہ افزائی نہیں ملتی تھی۔ اس کو نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس بنا پر اس قسم کی کوششیں اگر انفرادی سطح پر ظاہر بھی ہوتیں تو وہ اکثر دب کر رہ جاتی تھیں۔ لوگ مرض اور علاج کا رشتہ دیوتاؤں سے جوڑے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں سائنسی طریق علاج کی بات لوگوں کو اپیل نہیں کرتی تھی۔ اسلام کے ذریعہ جب دنیا میں توحید کا انقلاب آیا، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ طبی ترقی کا وہ دروازہ کھلے جو بالآخر جدید میڈیکل سائنس تک پہنچ

جائے‘‘۔(اسلام دور جدید کا خالق،ص:۴۳۷)

عبدالقادرلون نے ’’بیمارستان/ شفاخانے‘‘ کے ایک ذیلی عنوان کے تحت قدیم ہسپتالوں کا بھی اس لیے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ یہ تذکرہ اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک شفاخانوں پر گفتگو نہ کی جائے۔ لکھتے ہیں:

’’مورخین نے عہد وسطیٰ کے شفاخانے کے لیے ’’بیمارستان‘‘ کا لفظ استعمال کیا ہے، جو دو لفظوں ’بیمار‘ اور ’ستان‘ (جگہ) سے مل کر بنا ہے۔ یوں فارسی زبان کی اس ترکیب ’بیمارستان‘ کے معنی ’بیمار کی جگہ‘ ہے۔ عربوں کے یہاں اس کے استعمال کی وجہ یہ ہے کہ ایران کے صوبہ خوزستان کے شہر جندی شاپور میں ساسانی حکمرانوں نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جہاں طب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مدرسے میں ایک بیمارستان بھی تھا۔ اس مدرسے نے مسلم طب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ایرانی اثرات ہی کا نتیجہ تھا کہ عربوں نے شفاخانے کے لیے فارسی ترکیب ’’بیمارستان‘‘ لی اور اسے اپنے یہاں رائج کیا۔ بیمارستان کا لفظ آگے چل کر ’’مارستان‘‘ بن گیا۔ اکثر طبی تصانیف میں مارستان ہی استعمال ہوا ہے‘‘۔(ص:۲۹۴۔۲۹۵)

’’ازمنہ وسطیٰ کے مسلم شفاخانوں میں اطباء متعین ہوتے تھے۔ بیمارستان عضدی میں چوبیس اطباء خدمات انجام دیتے تھے۔ ہسپتال میں ماہرین خصوصی کی مختلف جماعتیں کام کرتی تھیں۔ جن میں طبائیعیوں (ماہرین عضویات) کحالون (ماہرین امراض چشم) جراحون (سرجن) اور مجبرون (ہڈی بٹھانے والے) ہوتے تھے۔ تبریز کے ربع رشیدی شفاخانے میں مختلف ممالک کے پچاس اطباء رہتے تھے۔ جراح، کحال اور مجبر اس کے علاوہ تھے‘‘۔(ص:۳۰۵)

’’عہد وسطیٰ کے مسلم شفاخانوں میں مریضوں کو جو سہولیات میسر تھیں وہ جدید دور کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں بھی فراہم نہیں ہوتیں۔ شفاخانوں میں کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی تھی۔ علاج ومعالجے کا سارا خرچہ اوقاف سے پورا کیا جاتا تھا۔ ہسپتال کے بیرونی حصے میں نووارد مریض کا سب سے پہلے گہرا

معاینہ کیا جاتا تھا۔ مرض اگر ہلکا ہوتا تو اسے نسخے لکھ دیتے اور وہ شفاخانے کی ڈسپنسری سے دوا لے کر چلا جاتا۔ بیماری زیادہ ہوتی تو مریض کا نام و پتہ درج کیا جاتا۔ حمام میں اس کے کپڑے اتروا کر ایک مخصوص گودام میں جمع کئے جاتے، پھر اسے شفاخانے کے کپڑے پہنا کر متعلقہ وارڈ میں پہنچا دیا جاتا، جہاں پاک وصاف بستر والا پلنگ الاٹ ہوتا۔ اس کے بعد ڈاکٹر اس کا علاج شروع کرتے تھے۔ دوا اور غذا تجویز ہوتی تھی۔ کھانے میں بکری، گائے، تیتر، مرغ اور دوسرے پرندوں کا گوشت فراہم کیا جاتا تھا۔ روبہ صحت مریض جب مقررہ روٹی اور سالم مرغی ایک دفعہ کھاتا اور اسے ہضم کر جاتا تو اسے تندرست مانا جاتا۔ بیمارستان احمد ابن طولون میں مریض جب مرغ کا شوربا اور پھلکے کھانے لگتا تب اسے گھر جانے کی رخصت ملتی تھی۔ بیمارستان کبیر دمشق میں مریضوں کے اخراجات کی تفصیل درج ہوتی تھی۔ بیمارستان صلاح الدین ایوبی میں مریضوں کے لیے شاندار کمرے تھے، ہر کمرے میں پلنگ اور اس پر سلیقہ سے بچھونے اور تکیے رکھے ہوتے تھے''۔ (ص:۳۱۰)

گیارھواں باب: ''فلسفہ'' (Philosophy) کے عنوان سے ہے جس میں بعض مغربی مصنّفین کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ مسلمانوں نے یونان کی فلسفیانہ کتابوں کے صرف ترجمے کیے ہیں اور اپنی طرف سے اس میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا۔ لکھتے ہیں:

''بعض مغربی مصنّفین کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے یونان کی فلسفیانہ کتابوں کے صرف ترجمے کیے ہیں۔ اپنی طرف سے اس میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا۔ اس غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مسلم فلسفے کے اصل ماخذ ان لوگوں کی رسائی سے باہر ہیں اور اپنی عدم رسائی کا اعتراف کرنے کے بجائے یہ حضرات مسلم فلسفے کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں''۔

وہ موسیو سیدیو کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

''یورپ والے کہتے ہیں کہ عربی فلسفہ کوئی چیز ہی نہیں۔ عرب فلسفہ کو کیا

جانیں؟ لیکن یہ کہنے والے اس لیے معذور مانے جاسکتے ہیں کہ ان بے چاروں کو عربوں کے علمی مشاغل اور دماغی کارناموں کا علم ہی نہیں۔ فلسفیان یورپ ذرا غور سے کام لیں اور اپنے ہی یہاں کی علمی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ان کو بہ ادنیٰ تامل معلوم ہو سکے گا کہ قرونِ متوسط میں یورپ کے مدارس جن فلسفی کتابوں کا درس دیا کرتے تھے، وہ سب فلاسفۂ عرب کی تالیفات سے خوشہ چیں ہو کر تالیف ہوئی تھیں''۔ (ص:۳۲۱)

اس کے بعد ابو یوسف یعقوب الکندی، ابو نصر الفارابی، ابن سینا، امام غزالی، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد وغیرہ کئی مسلم فلسفیوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

امام غزالی (۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء۔ ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) کے متعلق لکھا کہ:

''امام غزالیؒ کی شخصیت، طریقۂ تحقیق اور ان کے افکار کی بازگشت یورپ کے مفکرین اور سائنس دانوں کے یہاں مختلف ادوار میں سنائی دیتی ہے۔ علمائے مشرق و مغرب نے ان کے اور رینی ڈیکارٹ کے درمیان کئی مماثلتیں تلاش کی ہیں۔ جدید فلسفے کے باوا آدم ڈیکارٹ امام غزالی کی وفات کے ۴۸۵ برس بعد ۱۵۹۶ء میں مراکش کے شہر تورین میں پیدا ہوئے تھے''۔ (ص:۳۳۸)

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۱۴ء) نے امام غزالی کی سوانح عمری ''الغزالی'' کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں انھوں نے ان کے حالات زندگی کے علاوہ ان کے افکار و نظریات خاص کر علم الکلام اور فلسفہ کے حوالے سے ان کی تصانیف پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں:

''ارسطو نے فلسفہ کی جب تدوین کی تو افلاطون نے سخت ناراض ہو کر کہلا بھیجا کہ تم نے اسرار اور رموز کا طلسم توڑ دیا۔ ارسطو نے جواب میں کہلا بھیجا کہ گو میں نے اسرار بیان کیے لیکن ایسے الفاظ میں بیان کیے کہ عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ مسلمانوں میں فلسفۂ ارسطو کا سب سے بڑا مفسر ابن سینا ہے۔ اس کی یہ حالت ہے کہ معمولی بات کو بھی اس قدر اینچ پینچ کے ساتھ اور ایسی مہیب اور پُررعب عبارت میں ادا کرتا ہے کہ وہی معمولی بات عالم ملکوت کے فوق الادراک الہامات معلوم ہوتے ہیں۔ امام غزالی نے اس طلسم کو بالکل توڑ

دیا، وہ دقیق سے دقیق اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کو اس طرح تحلیل کرتے ہیں
اور ایسے الفاظ میں ادا کرتے ہیں کہ معمولی صاحب استعداد کی سمجھ میں آ جائے۔
(الغزالی،ص:۹۸،ایڈیشن ۱۹۵۶ء)

ابن رشد اور دوسرے مسلم حکماء کے فلسفیانہ افکار ونظریات پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے کہ ابن رشد کے فلسفیانہ افکار ونظریات کے اثرات اہل کلیسا پر گہرے اور نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔آخر میں لکھا گیا کہ:

"کلیسا نے صدیوں تک عقلیت اور آزاد خیالی کا انسداد کرنے کے لیے آگ اور خون کی ہولی کھیلی، انسان کے خون سے سرزمین یورپ کے ذرے ذرے کو لال کیا اور ذہن کے دریچوں پر پہرے لگائے۔لیکن اس طویل خون آشام کارروائی کا نتیجہ عیسائی مذہب کے حق میں بڑا منحوس تھا۔عقلیت کے طوفان کی لپیٹ میں آکر کلیسا کی ڈگمگاتی عمارت ملبے کے ڈھیر میں بدل گئی اور پھر جو بنی مگر پہلی جیسی نہ تھی۔اب اس میں سب کچھ تھا مگر مذہب نہ تھا، گرجا تھا، دعا نہ تھی، پوپ تھا مسیح علیہ السلام نہ تھے"۔(ص:۳۶۳)

کتاب کے تازہ ایڈیشن میں ایک اضافہ "نگاہ واپسیں" کے نام سے ہے جس میں بعض تلخ حقیقتیں سامنے لائی گئی ہیں۔مثلاً:

"مسلمانوں کی تصنیفات کے یہودی اور عیسائی مترجمین نے ہزاروں ترجموں کو اپنی تصنیفات کے طور پر مشہور کیا۔مسلم ایجادات کو اپنے ناموں یا مغرب کے کسی شخص کی طرف منسوب کیا اور ان کے علمی کارناموں کا سرقہ کر کے بددیانتی کی شرم ناک مثالیں قائم کیں۔مغربی مترجمین اور سائنس دانوں کے ان علمی سرقوں کو یورپ اور امریکہ کے منصف مزاج محققین نے بے نقاب کیا ہے"۔(ص:۳۷۶)

"مسلمانوں کے علمی آثار نے یورپ کے تاریک دماغوں میں روشنی پیدا کی مگر ان کے دل سیاہ رہے۔تعصب ایک ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔مسلم شہروں میں جب عیسائی اور یہودی شائقین کتابوں کی تلاش میں پھرتے

تھے تو اس وقت ایک دوربین عالم اور ادیب وشاعر ابن عبدون (المتوفی ۵۲۹ھ/ ۱۱۲۵ء) نے مسلمانوں کو خبردار کیا تھا کہ ہمیں یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں اپنی علمی کتابیں بیچنے سے بچنا چاہیے، کیونکہ یہ لوگ ہماری کتابوں کے ترجموں کو اپنے ناموں سے منسوب کرتے ہیں جبکہ یہ مسلمانوں کی علمی کوششوں کا ثمرہ ہوتے ہیں۔ بعد کے واقعات نے ابن عبدون کی حرف بہ حرف تائید کی۔ مسلمانوں کا علمی سرمایہ جب اہل مغرب کے ہاتھ لگا تو انھوں نے ہزاروں عربی کتابوں کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ ترجمے جس تیز رفتاری کے ساتھ اور جس وسیع پیمانے پر ہورہے تھے اس کا اندازہ ایک فاضل آلیور آف برٹنی کے اس قول سے ہوسکتا ہے کہ صرف فلکیات کی مترجمہ کتابوں اور ان کے مصنّفین کا شمار کرنے لیے ایک دن کافی نہ تھا۔ المیہ یہ ہے کہ ان مترجمین میں ان گنت وہ تھے جنھوں نے عربی کتابوں کے ترجمے کیے اور انھیں اپنی طبع زاد تصنیفات کہہ کر اپنے ناموں سے منسوب کیا۔ علمی سرقوں کا یہ کام وسیع پیمانے پر ہوا۔ اس پر مغرب کی ''زرخیزئی دماغ'' کے بلند بانگ دعوے کیے گئے اور یورپ کی علمی برتری کے راگ الاپے گئے''۔ (ص:۳۷۲)

اس سلسلہ میں مصنف کی یہ چند سطریں بھی غور طلب ہیں:

''گزشتہ صدی کے دوران تجدد پسندوں نے زبردست شور مچایا کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں مگر عملاً ان لوگوں کی غلط پالیسیوں سے ملت اسلامیہ روز بروز پیچھے کی طرف چلی گئی۔ آج مسلم نوجوان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے اسلاف، ان کی تاریخ اور ان کے علمی کارناموں سے آگاہ نہیں ہے۔ اس کے دل میں کوئی ولولہ اور جذبہ نہیں ہوتا۔ وہ جدید تہذیب اور تمدن کے سامنے مرعوب اور بے بس نظر آتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ موجودہ تہذیب کی اساس مسلمانوں نے رکھی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا ہے کہ عصر حاضر کی تعمیر وتشکیل میں اسلام نے بنیادی رول ادا کیا ہے۔ (ص:۴۰۸)

آخر میں عرض ہے کہ ڈاکٹر لون صاحب کی زیر نظر کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ عظیم اور ناقابل تردید سچائی سامنے آتی ہے کہ ایک دور وہ تھا جب سب کچھ مسلمانوں کے پاس تھا۔ علم وآگہی

اور کتابوں کے خزانے بھی انہی کے پاس تھے اور اس زمانے میں مغرب و یورپ کے طالبین علم ان کے سامنے بھکاریوں کی طرح اپنا کشکول لیکر آتے اور ان سے سبق پڑھتے تھے اور یہی لوگ بعد میں مستشرقین کہلائے اور مغرب و یورپ میں سائنسی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے موجب بن گئے۔لیکن افسوس کہ آج وہی مسلمان زوال وانحطاط کا شکار ہیں۔ چنانچہ موجودہ دور کے مسلمانوں کی اس ابتری وتنزلی پر ایک اہل دانش نے بڑی دلسوزی سے لکھا ہے۔جس کا ایک اہم حصہ یہاں تبصرے کے اختتام پر نقل کیا جاتا ہے۔

''عصر حاضر کا یہ عظیم المیہ ہے کہ مسلمانوں کا جس قدر علمی عروج اسلام کے ابتدائی دور سے لیکر کئی صدیوں تک قائم رہا، اسی قدر وہ آج انحطاط وتنزل کا شکار ہیں۔صرف علم میں فقدان کے باعث ہم کئی اور شعبوں میں بھی مغرب کے غلام بن چکے ہیں۔معیشت، معاشرت، ثقافت وسیاست اور دیگر کئی معاملات میں ہم اغیار کے محتاج ہیں۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے جس کا بدقسمتی سے ہمیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔مسلمان جس کی تخلیق دنیا کی راہنمائی کے لیے کی گئی تھی۔آج خود نشان منزل کھو چکا ہے۔اور سراب سفر کو مقصود حقیقی سمجھ کر اس پر قانع وشاکر ہے۔اسی لیے ذلت ومسکنت کے گہرے بادل شش جہت سے ہمیں اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے شاندار ماضی اور عبرتناک حال کو دیکھ کر مستقبل کو درخشان کرنے کی بہتر منصوبہ بندی کریں''۔(اسلام، سائنس اور مسلمان، ص:۳۴۷، مرتب ابوعلی عبدالوکیل)

اسلام کی خوشی کوئی پامال کرگیا　　دریائے انبساط چڑھا تھا اُتر گیا

شیرازۂ سکون وتمنا بکھر گیا　　وہ دن گزر گئے، وہ زمانہ بدل گیا

یا الٰہی ہو، امام وقت کا، جلدی ظہور

قافلہ اسلام کا، بے تاج وبے سر ہوگیا

بہار ایجادی بیدل
بیدل شناسی پر ایک وقیع اضافہ

جناب عارف نوشاہی

میرا سید نعیم حامد علی الحامد کے نام اور کام سے تعارف کا واقعہ تھوڑا دلچسپ ہے، اسے تمہید کے طور پر عرض کردوں پھر اصل موضوع کی طرف آؤں گا۔ ۲۰۰۵ء میں بہار شریف، بھارت کے سہ ماہی مخدوم، شمارہ ۳، (۲۰۰۳ء) میں شائع ہونے والے ایک مضمون ''مدینہ منورہ کے کتب خانوں کے بعض جواہر پارے'' (ص ۱۳۳۔۱۳۷) نظر سے گذرا جس میں دیوان والہٗ داغستانی، خریطۂ جواہر مظہر جان جاناں، دیوان شیخ خالد نقشبندی مجددی کے مخطوطات کا ذکر تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ مضمون نگار مدینہ میں بیدل کے مخطوطات پر کام کر رہے ہیں۔ مضمون نگار سید نعیم حامد علی الحامد تھے۔ میں اس نام کی ترکیب پر غور کرتا رہا جو بالکل عربوں کی طرح تھا لیکن ان کی وطنیت یا قومیت کے بارے میں شرح صدر نہیں ہو رہا تھا۔ مضمون اردو میں تھا اور نفس مضمون سے بھی ہندوستانی مزاج جھلکتا تھا۔ لیکن بات مدینہ کے مخطوطات کی تھی اور نام کی ترکیب اور اس میں ''الحامد'' کے جز نے مجھے مخمصے میں ڈالا ہوا تھا، ہو نہ ہو یہ صاحب عرب ہیں اور انہیں ہندوستان کے فارسی ادب سے دلچسپی ہے؟ مجھے اس مضمون کا ایک حوالہ دینا تھا، وہ میں نے دے دیا اور بات رفت وگذشت ہوگئی۔

مئی ۲۰۰۹ء میں عمرے کے لیے رخت سفر باندھے بیٹھا تھا۔ اسلام آباد سے پرواز سے چند گھنٹے قبل ڈاک سے ماہنامہ اخبار اردو، اسلام آباد کا تازہ شمارہ ملا، جس میں بہار ایجادی بیدل کی طباعت اور مدینہ منورہ میں پہلی اردو لائبریری کے قیام کی خبر شائع ہوئی تھی اور دونوں خبروں میں نام

ادارہ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد۔

سید نعیم حامد علی الحامد کا تھا۔ بہار ایجادی بیدل ان کی تصنیف تھی اور اردو لائبریری کے وہ مہتمم تھے۔ میں مدینہ تو جا ہی رہا تھا، ارادہ کرلیا کہ یہ لائبریری بھی دیکھوں گا اور اسی بہانے سے ان سے ملاقات بھی ہوجائے گی۔ اخبار اردو کے مدیر اعلیٰ افتخار عارف صاحب سے نعیم حامد علی الحامد کا فون نمبر لیا اور مدینہ پہنچ کر انہیں اپنی آمد کی اطلاع دی۔ وہ میرے ہوٹل تشریف لائے، لباس تو عربی ہی تھا لیکن زبان عجمی۔ لیکن جب انہوں نے اپنے ڈرائیور سے بات کی تو فصیح عربی میں۔ حافظ شیرازی کا مصرعہ یاد آ گیا:

زبان خموش و لیکن دہان پراز عربیست

سید صاحب مجھے اپنے مکان پر لے گئے اور اپنا کتب خانہ دکھایا جسے مدینہ میں اردو کی پہلی لائبریری ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ سید صاحب کا ذاتی کتب خانہ ہے جس میں ان کی دلچسپی کے موضوعات کی کتب، رسائل اور مخطوطات کے عکس رکھے ہیں۔ اسی ملاقات میں انہوں نے مجھے اپنی تازہ تصنیف بہار ایجادی بیدل کا نسخہ عنایت کیا اور اس پر کچھ لکھنے کا حکم بھی دیا۔ میں نے وعدہ کرلیا اور ایفائے عہد کی نیت سے سفر عمرہ کے دوران ہی کتاب کا مطالعہ کرکے، یادداشتیں لکھ لی تھیں لیکن حسب منشا انہیں ترتیب دینے کا وقت نہ مل سکا۔ اب سید صاحب یہاں اسلام آباد تشریف لائے ہیں تو ان سے ملاقات پر ندامت سے بچنے کے لیے چند سطور لکھ کر لایا ہوں۔ اسے برگ سبز سمجھیں۔ حساب دوستاں درسینہ باشد، ان سے درخواست ہے کہ ان چند کلمات کو وہ اسی عہد کی تعمیل سمجھیں اور اپنے دفتر قرض میں اس بے نوا کے نام کے آگے خط کھینچ دیں۔

عبداللہ اختر (۱۸۷۶ـ۱۹۵۹ء) کی ''بیدل'' (اشاعت اول: لاہور، ۱۹۵۲ء)؟ اور ڈاکٹر عبدالغنی (۱۹۱۰ـ۱۹۸۹ء) کی تین کتابوں Life and Works of Abdul Qadir Bedil (لاہور، ۱۹۶۰ء) ''روح بیدل'' (اشاعت اول: لاہور، ۱۹۶۸ء) اور ''فیض بیدل'' (اشاعت اول: لاہور، ۱۹۸۲ء) کے بعد پاکستان میں فارسی کے صاحب اسلوب شاعر میرزا عبدالقادر بیدل (۱۰۵۴ـ۱۱۳۳ھ) کے فکروفن اور سوانح حیات پر کسی قابل ذکر کتاب کی اشاعت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ یہ سکوت سید نعیم حامد علی الحامد (پ: ۱۹۴۵ء) کی کتاب ''بہار ایجادی بیدل'' کی ۲۰۰۸ء میں لاہور سے اشاعت سے ٹوٹا ہے۔ کتاب بابر علی فاؤنڈیشن، پیکیجز لمیٹڈ، لاہور نے اپنی روایت

کے مطابق بڑی آب وتاب سے شائع کی ہے۔

یہ کتاب اپنی پیش رو کتب سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں بیدل کے منتخب اشعار کے منثور ومنظوم اردو ترجمے کے علاوہ، بیدل کے شاگردوں اور کچھ بیدل شناسوں کا تذکرہ بھی ہوا ہے۔ مزید یہ کہ مصنف نے بڑی محنت سے بیدل کی نثری اور شعری تصانیف کے مختلف ایڈیشنوں کے مندرجات کے اعداد وشمار (تعداد اشعار/رقعات) جمع کیے ہیں۔ نیز بیدل کی کہی ہوئی تاریخوں کا استخراج کرکے ان کی توثیق کی ہے۔ مصنف نے تصانیف بیدل کے مختلف ایڈیشنوں اور بیدل پر کتب ومقالات کا جس طرح تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، اس نے اس کتاب کو وقیع بنادیا ہے۔ تحقیق کا اصول بھی یہی ہے کہ اس موضوع پر پیش رووں کے کام کا جائزہ لیا جائے تاکہ اپنے کام کی انفرادیت سامنے آسکے۔ اس ضمن میں کلیات بیدل مرتبہ اکبر بہداروند اور پرویز عباس داکانی (تہران ۱۹۹۷ء) کا جو بسیط مطالعہ سید صاحب نے کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان ایرانی مرتبین نے بیدل کا کلام مرتب کرنے میں کس قدر غیر ذمہ داری اور سہل انکاری سے کام لیا ہے۔ سید صاحب کو اس ایرانی ایڈیشن کی صرف ایک جلد میسر آئی، اگر باقی دو جلدیں بھی ان کے ہاتھ آجاتیں تو یہ ایک بھرپور تبصرہ ہوتا۔ بہرحال اب بھی جو کچھ انھوں نے پیش کیا ہے وہ چشم کشا ہے۔ ان کے اس تبصرے سے خود مجھے اپنے اس نظریے کے لیے بڑی حمایت اور تقویت ملی کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر باقی معاصر ایرانیوں کی برصغیر کے متون پر تحقیق وتدوین کو چنداں اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ پروفیسر نبی ہادی کی کتاب ''میرزا عبدالقادر بیدل'' پر تبصرہ کرتے ہوئے سید صاحب نے اسے ''بیدل دشمنی کی نادر مثال'' قرار دیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں انہیں پروفیسر نبی ہادی کے نظریات کو رد کرتے وقت زیادہ پرزور دلائل سے بات کرنی چاہیے تھی۔

سید صاحب نے بیدل پر لکھی جانے والی جن کتب کا محاکمہ کیا ہے، ان میں ایرانی محقق ڈاکٹر محمد رضا شفیعی کدکنی کی ایران میں مقبول عام اور بیدل شناسی پر ایران میں رجحان ساز کتاب شاعر آینہ ہا کا ذکر نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ کتاب بہت پہلے چھپ چکی تھی۔

سید صاحب نے بیدل شناسوں میں افغان محقق عبدالحئ حبیبی کو اس لیے شامل کیا ہے کہ انھوں نے تصانیف بیدل کو کابل سے طبع کرانے کا اہتمام کیا۔ شاید یہ کام ان کے فرائض منصبی میں

شامل ہو، ورنہ جہاں تک مجھے علم ہے حبیبی مرحوم کی تصانیف اور مقالات کی فہرست میں بیدل سے متعلق کوئی کام نہیں ہے۔

خود سید صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ عباداللہ اختر بیدل شناسوں میں نمایاں اور اہم مقام رکھتے ہیں (ص ۴۷۶) لیکن ان کی تصنیف ''بیدل'' جو مصنف کے چالیس سالہ مطالعہ کا نچوڑ ہے، اس پر سید صاحب نے صرف چند سطریں لکھی ہیں۔ یہ کتاب اس سے زیادہ توجہ کی مستحق ہے۔

بندرابن داس خوش گو، بیدل کے شاگرد تھے۔ سید صاحب کو اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن سید صاحب لکھتے ہیں چونکہ خوش گو کا یہ بیان سفینۂ خوش گو کے دوسرے دفتر میں ہے، جو ان کی نظر سے نہیں گذرا، اس لیے متردد ہیں۔ خوش گو کی عبارت بالکل واضح ہے:

ازعنفوان شعور بہ خدمتش بندگی داشتہ و	یعنی ابتدائے شعور ہی سے بیدل کی خدمت
رسائل عروض وقافیہ ومعما واکثر دواوین	میں جاتے تھے اور عروض، قافیہ، معما پر رسائل
تازہ گویان پیش او گذرانیدہ۔	اور اکثر تازہ گو شعرا کے دواوین انہی کی خدمت
	میں پڑھے۔

سفینۂ خوش گو کا دفتر سوم جو سید صاحب نے ملاحظہ کیا ہے خود اس میں یہ عبارت موجود ہے:

فقیر خوش گو در عمر خود زیادہ از ہزار مرتبہ بہ	فقیر خوش گو اپنی عمر میں ہزار مرتبہ سے زیادہ
خدمتش مستفید شدہ۔	بیدل کی خدمت سے مستفید ہوا۔

لہٰذا کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ خوش گو کو بیدل کا شاگرد نہ مانا جائے۔

ہاں، سید صاحب نے سراج الدین علی خان آرزو کو بیدل کے شاگردوں میں جو شمار کیا ہے، وہ مشکوک ہے۔ سید صاحب نے لکھا ہے کہ آرزو کا تذکرہ مجمع النفائس ان کی دسترس میں نہیں تھا جس سے یہ بات درجۂ یقین تک پہنچ جاتی۔ مجمع النفائس تین جلدوں میں ۲۰۰۴-۲۰۰۵ء میں اسلام آباد سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کی پہلی جلد کے ص ۲۴۰-۲۴۱ پر بیدل کے حالات درج ہوئے ہیں۔ آرزو نے لکھا ہے: فقیر آرزو دو بار بہ خدمت ایں بزرگوار اوایل عہد پادشاہ شہید محمد فرخ سیر رسیدہ و مستفید گردیدہ۔ اس بیان میں صرف دو بار ملاقاتوں کا ذکر ہے، اگرچہ آرزو نے بیدل سے مستفید ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن یہ استفادۂ صحبت ہے نہ کہ استادی شاگردی۔

سید صاحب نے ایک جگہ محمد شفیع وارد کی کتاب مرآت واردات کا بالواسطہ حوالہ دیا ہے اور اسے نایاب لکھا ہے (ص ۱۸۲)۔ یہ کتاب حال ہی میں ایران سے شائع ہو کر مجھ تک پہنچی ہے۔ میں نے بڑے شوق سے اس میں سے بیدل کے حالات دیکھنا چاہے، لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ کتاب کے ایرانی مرتب ڈاکٹر صفت گل نے اس کا صرف وہ حصہ شائع کیا ہے جو صفوی حکومت کے زوال کے بارے میں ہے اور شعرا، علما وغیرہ کے حالات شامل نہیں کیے!

بہار ایجادی بیدل کے مضامین میں تقدیم و تاخیر بھی ہے۔ مثلاً بیدل کے خاندان اور مقام پیدائش کا تذکرہ اس کی اپنی اولاد کے بعد آیا ہے (ص ۱۸۱)، میرے خیال میں اسے پہلے ہونا چاہیے تھا۔

بہار ایجادی بیدل کی ایک اور خصوصیت، مصنف کا الفاظ پر اعراب لگانا ہے۔ صحت تلفظ کے لیے یہ اہتمام قابل تحسین ہے، لیکن اس میں افراط سے کام لیا گیا ہے۔ جب بیدل پر کتاب پیش کی جا رہی ہو تو معلوم ہے کہ اس کے قارئین معمولی پڑھے لکھے نہیں ہیں کہ ان کے لیے ''ہَے''، ''ہَیں''، ''وُہ''، ''اُردُو'' جیسے الفاظ پر زیر زبر لگائی جائے۔ لگتا ہے فاضل مصنف سعودی عرب میں رہتے ہوئے عربی زبان کے زیر اثر ہیں، اس لیے ضبط تلفظ کا التزام کیا ہے۔

ایک اور بات جو میں نے کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس کی وہ اطناب ہے۔ لب مطلوب جو ایک جملے میں کہا جا سکتا ہے، اسے جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ بعض اوقات یہ جزئیات، لکھنے والے کے لیے تو دلچسپ ہو سکتی ہیں، عام قاری کو ان سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔

اگر سید صاحب اس کتاب پر نظر ثانی کرنے کے بعد اس کی اشاعت دوم کا ارادہ رکھتے ہیں تو میری تجویز ہے کہ اس میں سے بیدل کے اشعار کے تراجم کو الگ کر دیا جائے اور اس کتاب کو صرف سوانحی تحقیق اور دیگر مباحث تک محدود رکھا جائے۔ نیز یہ درخواست ہے کہ اس میں کتابت اور املاء کی اغلاط درست کر لیں۔ اتنی خوبصورت کتاب میں کتابت کی اغلاط سے قاری اسی طرح بدمزہ ہوتا ہے جیسے زعفرانی پلاؤ کھاتے ہوئے دانتوں تلے کنکر آ جائے!

ضرب الامثال عربی ادب کے تناظر میں

ڈاکٹر سفیان حسان خاں ندوی

مثال کی لغوی تعریف: لغت میں مثال کی تعریف یہ ہے کہ جس کے ذریعہ مثال دی جائے وہ مماثلت اور مشابہت کے معنی میں آتی ہے، کسی چیز کے ذریعہ کسی دوسری چیز کی مثال دینا جو اس کے برابر اور اس کے مشابہ ہو۔

المثل میم اور ثاء کے فتح کے ساتھ جس کے معنی نظیر کے ہوتے ہیں، پھر اسی سے تمام قول نقل کیے جاتے ہیں یعنی مثل کا اپنے مضرب اور مورد کے ساتھ پھیلنا (۱)۔ لسان العرب میں ہے، مثل ایک کلمہ ہے کہا جاتا ہے هذا مِثلَهُ و مَثَلُهُ، مماثلت اور مساوات کے درمیان فرق ہے، مساوات دو مختلف چیزوں اور دو متفق چیزوں کے درمیان بھی ہوتی ہے اس لیے کہ مساوات ایسی برابری ہے جو نہ زیادہ ہوتی ہے نہ کم اور جہاں تک مماثلت کا تعلق ہے تو وہ صرف دو متفق چیزوں کے درمیان ہی پائی جاتی ہے جیسے نحوه کنحوه، لونه کلونه، طعمه کطعمه، جب یہ کہا جائے کہ وہ مطلقاً اس کے مثل ہے تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ اس کے بالکل برابر ہے، ابن عربی نے ذکر کیا ہے کہ المثل میم اور ثاء کے فتح کے ساتھ والمثل میم کے کسرہ اور ثاء کے فتحہ کے ساتھ ایسا لفظ ہے جو معقول چیزوں کی مشابہت کے طور پر استعمال ہوتا ہے (۲) اور المثل میم کے کسرہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ ایسا لفظ ہے جو محسوس چیزوں کی مشابہت کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور کبھی دونوں ایک دوسرے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔

المیدانی جو مثالوں کی کتاب کے مولف ہیں انھوں نے مبرد سے نقل کیا ہے کہ المثل وہ چلنے

برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال۔

والا قول ہے جس میں دوسرے والے کے حال کو پہلے والے کے حال سے مشابہت دی جاتی ہے اور اس میں تشبیہ کے معنی پائے جاتے ہیں، جیسے کہ عربوں کا قول ہے مثل بین یدیہ یعنی نصب کی ہوئی تصویر کے سامنے تشبیہ بن کر رک جاؤ، فلان امثل من فلان یعنی وہ افضلیت میں اس کے مشابہ ہے۔

مثال کی حقیقت یہ ہے کہ پہلے والے حالات کی تشبیہ کے لیے وہ علامت ہوتی ہے اسی وجہ سے اس کا نام حکمت رکھا گیا ہے جو اپنی سچائی کی وجہ سے عقلوں پر مثال بن کر حاوی ہوجاتی ہے جیسے اس کی صورتیں عقلوں میں پیوست ہوجاتی ہیں، یہ مثول سے مشتق ہے جس کے معنی نصب ہونے کے آتے ہیں (۳)، ابو ہلال العسکری صاحب ''جمھرۃ الامثال'' نے لکھا کہ جتنی بھی حکمتیں پھیلی ہوئی ہیں وہ اصلاً مثال ہیں اگر وہ عام نہ ہوں تو وہ مثال نہیں ہیں اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر کوئی قول پھیلے اور عام ہوجائے اور لوگوں کی زبانوں پر خوب چلنے لگے تو وہ مثال ہوجاتی ہے اگر کوئی قول کسی تجربہ کی بنیاد پر جاری ہو لیکن عام نہ ہوا ہو تو وہ حکمت کہلائے گی۔ (۴) ان تمام تعریفات کے احاطہ کے بعد اس کی تعریف یوں ہوگی:

> ''مثال ایسا قول ہے جو مختصر، عام اور معنی کے لحاظ سے ٹھوس ہو جس کے ذریعہ نئے واقعہ کی تشبیہ پرانے واقعہ سے دی جائے''۔

مثال کی اصطلاحی تعریف: علمائے لغت، مفسرین، ماہرین نحو، بلاغت اور خود جامعین امثال میں سے کوئی بھی مثال کی جامع اور مانع اصطلاحی تعریف تک نہ پہنچ سکا، یہ اس وجہ سے کہ مثال کے الفاظ کا اطلاق مختلف اور متباین معنی اور تعبیرات کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ جب مثال کی اصطلاحی تعریف کے مختلف معنی میں سے کسی ایک معنی کے اندر توسیع کی جاتی ہے تو دوسرے معنی کے اندر تنگی پیدا ہوجاتی۔

اسی وجہ سے اس کی ایسی اصطلاحی تعریف تک پہنچنے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا البتہ اقوال میں اہم ترین کا ذکر ضروری ہے جیسے ابوعبیدہ قاسم ابن سلام (م ۲۲۴ھ) مثال کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جاہلیت اور اسلام میں عرب کی حکمت کی باتوں کو مثال کہتے ہیں وہ اس کے ذریعہ اپنے کلام کو پیش کرتے اور اپنی ضروریات تک کنایہ اور اشارہ کے

ذریعہ بغیر صراحت کے پہنچ جاتے تھے، اس کی تین اہم خصوصیتیں ہیں کم الفاظ، معنی کی پختگی اور حسن تشبیہ''۔(۵)

ابوعبیدہ قاسم کا خیال ہے کہ:

''مثال وہ حکمت ہے جو روزمرہ کی زندگی کے تجربات پر غوروخوض کرنے اور تعبیرات کو بالواسطہ بیان کرنے سے پیدا ہوتی ہے''۔

پھر انہوں نے اس کی ممتاز علامتیں جیسے کم الفاظ، معنی کی پختگی اور حسن تشبیہ بیان کیں۔ وہ اس تعریف میں معتزلہ کے امام ابراہیم بن سیار نظام کے ساتھ (م ۲۲۱ھ) پوری طرح متفق ہیں، انہوں نے مثال کی تعریف میں چار چیزوں کو جمع کر دیا جو کسی دوسرے کلام میں نہیں پائی جاتیں: کم الفاظ، معنی کی پختگی، حسن تشبیہ اور کنایہ۔

ابن السکیت یعقوب ابن اسحاق (م ۲۴۴ھ) کہتے ہیں:

''مثال وہ لفظ ہے جو لفظاً مضروب لہ (یعنی جس واقعہ پر مثال دی جاتی ہے) کے مخالف ہو اور معناً اس لفظ کے موافق ہو''۔

ان کے اس قول سے دو چیزوں کی تاکید نظر آتی ہے ایک تمثیلیت دوسری اس کی بالواسطہ تعبیر۔ جاحظ نے بھی اپنی کتاب الحیوان میں بہت سی مثالیں بیان کی ہیں اس کی تعریف کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''مثال وہ ہے جس کے ذریعہ لوگ مثال دیں: فلاں شخص اپنے دشمن کو جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتا اس لیے کہ اس کے منہ میں پانی بھرا ہوا ہے اور پھر اس کو مثال بنالیا گیا جب انہوں نے دیکھا کہ اس کے منہ میں حقیقتاً پانی بھرا ہوا ہے اور وہ بولنے کی طاقت نہیں رکھتا''۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں:

''تیرنے کی صفت بطخ، گائے اور کتّے میں بھی ہوتی ہے لیکن مچھلی کا تیرنا اصل ہے اور مثال بھی اسی طرح ہے''۔(۶)

ان کے نزدیک مثال وہ ہے جس کا چلن عام ہو اور وہ قیاس سے منسوب کی جاتی ہو، مبرد

محمد بن یزید ثمالی (م ۲۸۶ھ) جاحظ کے ان اشارات سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کی تعریف میں کہتے ہیں:

> ''مثل ماخوذ ہے مثال سے یعنی ایسا عام ہونے والا قول جس سے دوسرے کو پہلے سے تشبیہ دی جاتی ہے اور اصل اس میں تشبہ بہ ہی ہے''۔

عربوں کا قول ہے مثال جب دی جاتی ہے تو وہ دماغ میں جگہ بنا لیتی ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ پہلے سے موجود صورت کے مشابہ ہو جاتی ہے، فلاں شخص بالکل فلاں کی طرح ہے یعنی فضل میں اس کے مشابہ ہے۔

مبرد نے لغوی اور اصطلاحی دونوں معنی ذکر کیے پھر ان دونوں کے درمیان جو گہرا تعلق ہے اس کو بیان کیا اور اس اصطلاحی تعریف میں مشابہت کو ضروری قرار دیا۔ حکیم ترمذی محمد ابن علی نے مثل کے معنی مثال سے اخذ نہیں کیے، انہوں نے کہا:

> ''مثالیں حکمتوں کے نمونے ہیں جو سماعت اور بصارت سے کبھی غائب نہیں ہوتے اور دیکھی ہوئی چیزوں کی طرف انسان کی رہنمائی کرتے ہیں''۔

مثالیں جن پر پوشیدہ چیزوں نے حیرانی کا پردہ ڈال رکھا ہے اور انسانی ذہن میں متعدد افکار کو جنم دیا ہے ان کے لیے وضاحتی ذرائع میں سے ہیں اس طرح مثالوں کی حیثیت معنوی امور کے لیے حسی نمونوں کی سی ہو گئی۔

مثال ان چیزوں تک پہنچنے کا ذریعہ ہے جہاں تک اس کے بغیر نہیں پہنچا جا سکتا اس کو حکیم ترمذی نے اسحاق ابن ابراہیم فارابی (م ۳۵۰ھ) سے نقل کیا ہے جیسا کہ ان کی مثال کی تعریف سے ظاہر ہوتا ہے:

> ''مثال وہ ہے جس سے عوام و خواص سب راضی ہو جائیں اس کے الفاظ اور معانی ان کے درمیان گردش کرنے لگیں خوشی اور غم کے مواقع پر اس کو کہنے لگیں اس کے ذریعہ قصوں کے مطالب تک پہنچیں اور اس کے ذریعہ سے پریشانیوں اور مصیبتوں سے نکلیں اور یہ مثالیں حکمت کی سب سے بلیغ شکل ہیں کیونکہ انسان کسی ناقص چیز پر جو مقصد تک نہ پہنچاتی ہو جمع نہیں ہو سکتے''۔

احمد بن محمد بن یحییٰ المز روقی (م ۴۲۱ھ) نے ان تمام سابقہ تعریفات سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے وہ کہتے ہیں:

''مثال بات کا ایک مختصر جملہ ہے جو سب میں مقبول اور مشہور ہوتا ہے کسی بھی مقصد کے لیے بغیر کسی لفظی تغیر و تبدیلی کے اسے نقل کیا جائے وہ صحیح ہوتا ہے اور معانی کی مشابہت کے اظہار کے لیے ظاہری شکل کو باقی رکھنا واجب ہوتا ہے اسی وجہ سے وہ مثال دی جاتی ہے اگرچہ ان اسباب کا علم نہ ہو جن سے وہ نکلی ہے''۔(۷)

جہاں تک علمائے بلاغت کا تعلق ہے انہوں نے مثال کی تعریف سے مشابہت اور مماثلت کو خارج کیے بغیر استعارہ کو بھی اس میں شامل کر دیا ہے، ماہر بلاغت شیخ عبدالقاہر جرجانی کہتے ہیں:

''ہر وہ جملہ جس کو تمثیلی کہنا صحیح نہ ہو لفظ مثل اس پر صادق نہیں آ سکتا''۔(۸)

وہ کہتے ہیں یہ بات بھی جاننا چاہیے کہ حقیقی مثال اور تشبیہ تمثیلی ایک جملے، دو جملوں یا متعدد جملوں میں ظاہری اور صریح تشبیہ پا سکتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس قول سے وہ اپنی مثال پیش کرتے ہیں:

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰٓي اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّھُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰىھَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰھَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔

اس آیت مبارکہ میں دو رکن (یعنی دنیاوی زندگی کی مثال اور عنفوان شباب پر پہنچ کر اس کا یکلخت ختم ہو جانا) بہت واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں جن کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری نہیں عبدالقاہر جرجانی کہتے ہیں اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ استعارۃً کہی گئی ہے جہاں تک تمثیل کا تعلق ہے تو وہ مجازی طور پر لائی جاتی ہے استعارہ کی شکل میں اس کی مثال آپ کا قول اس آدمی کے بارے میں جو کسی چیز کے کرنے اور چھوڑنے میں متردد ہو تو آپ کہیں گے میں تمہیں دیکھ رہا ہوں ایک پاؤں آگے بڑھاتے ہو اور دوسرا پیچھے ہٹاتے ہو۔

ابو یعقوب یوسف بن محمد السکاکی (م ۶۲۶ھ) نے مثال کی تعریف میں عام مثالوں کو

استعارہ کے اندر محصور کر دیا ہے وہ کہتے ہیں:

> ''پھر تشبیہ تمثیلی کا استعمال صرف استعارہ کے ذریعہ عام ہو جائے تو وہ مثال ہوگی اس کے علاوہ کو مثال نہیں کہیں گے''۔(۹)

علمائے لغت کے علاوہ جنھوں نے مختصر کتابیں، شرحیں اور حواشی لکھے مذکورہ قول کو مثال کی تعریف بیان کرنے والوں اور حدود متعین کرنے والوں نے بھی قبول کیا۔لغوی تعریف اصطلاحی تعریف سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

مذکورہ قول مثال کی تعریف میں زیادہ کشادہ ہے، اس میں مثالوں کی اقسام جیسے تمثیلی یا جو استعاراتی یا حکایت اور حکمت والی مثالیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں۔قصہ والی مثالوں میں نصیحت اور عبرت ہوتی ہے اور حکمت والی مثالیں وہ ہیں جو کسی واقعہ کی وجہ سے بیان کی جاتی ہیں جب کہ وہ اس واقعہ کے مطابق ہوں اور اس کی سچی صورت ہوں اسی وجہ سے اس کی تعریف یہ ہے **(الحکم القائم صدقها فی العقول)** قائم ہونے والی حکمتیں وہ ہیں جن کی سچائی کو عقلیں قبول کریں۔

یہ کہنے میں حرج نہیں کہ ضرب المثل کا مطلب نئے حالات پر مثال دینا اور اس کو پہلی حالت کے مشابہ پر منطبق کرنا ہے ''ضرب'' کی اصل کے بارے میں بہت بڑا اختلاف یہ ہے کہ یہ کس سے ماخوذ ہے یا تو زمین پر چلنے سے اور اس کے دور دراز گوشوں تک چلے جانے سے ہے جس سے چلنے والے کو مضارب کہا جاتا ہے یا پھر یہ خیمہ لگانے سے ماخوذ ہے یعنی اس کو نصب کرنا اس کے درمیان کے کھونٹے کو کھڑا کرنا اس کے چاروں کونوں کی میخوں کو ٹھیک کرنا اس اعتبار سے اس کے معنی لوگوں کے لیے مثال کو نصب کرنا اور اعلیٰ مقام عطا کرنا اور اس کے رواج عام کی وجہ سے دلوں میں اس کی اہمیت ثابت کرنا ہے، گویا خیمہ ان کی نظروں میں جما ہوا ہوتا ہے یا پھر یہ وقت کے طے کرنے سے ماخوذ ہے یعنی اس کے بیان کرنے اور محدود کرنے سے اس کا تعلق ہے ایک رائے یہ ہے کہ وہ درھم کے ڈھالنے سے ماخوذ ہے، اس کو ہتھوڑے سے مار کر بنایا جاتا ہے اور مثال کا دینا انسان کے دل پر اسی طرح اثر انداز ہوتا ہے جیسے ہتھوڑا اثر انداز ہوتا ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مشابہ اور نظیر سے ماخوذ ہے، اس لیے کہ اس کے ذریعہ دوسرے واقعہ کو پہلے کی طرح بنایا جاتا ہے یا پھر وہ مہر بنانے سے ماخوذ ہے اس لیے کہ مثال اور اس کے مضرب کے درمیان اس سے تطبیق پیدا کی جاتی ہے

جس طرح کہ مہریں جس چیز پر لگائی جاتی ہیں اس پر ان کی تطبیق ہوجاتی ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اینٹ بنانے سے ماخوذ ہے یعنی اس کو بنانا یا مٹی کو دیوار پر مارنا (۱۰)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسی ضرب سے ماخوذ ہے جس کے معنی ثابت ہونے کے ہیں جیسے اللہ کا قول و ضربت علیم الذلة و المسکنة یعنی ان پر ذلت اور مسکنت ثابت ہوگئی، عربوں کا قول یہ بھی ہے کہ پانچ کو چھ پر ضرب دینا یعنی ایسے واقعہ پر مثال دینا جس کے لیے اس کو وضع کیا گیا ہو اور اس کو صحیح ثابت کرنا (۱۱)۔ راغب الاصفہانی نے ضرب کے بارے میں علماء کے اختلاف کی بڑی اچھی توجیہ پیش کی ہے: اس اختلاف کا سبب شئ مضروب کی طبیعت سے جڑا ہونا ہے وہ کہتے ہیں ضرب کے معنی ایک چیز کا دوسری چیز پر واقع ہونا ہے ضرب کے تصور کے اختلاف کی وجہ سے اس کی تشریح میں بھی اختلاف ہے۔

ایک قول عادت کی مشابہت کے لیے بھی ہے الضریبة الطبیعة اور زمین پر مارنے سے مراد اس میں چلنا اور پیروں کو اس پر مارنا، ہتھوڑے سے خیمہ کو مارنے کا مطلب اس کی میخوں کو ہتھوڑے سے مارنا اسی طرح اللہ کا قول ضربت علیھم الذلة و المسکنة یعنی ان سے ذلت اور خواری ایسی چمٹ گئی جس طرح وہ کھمبا جس سے خیمہ چمٹ جاتا ہے جس پر وہ کھڑا ہوتا ہے، اسی طرح فضربنا علی آذانھم استعارہ ہے یعنی ہم نے ان کے کانوں کو تھپک کر سلادیا، اینٹوں کا مارنا یعنی بعض کو بعض پر رکھنا مثال کو مارنا جس طرح درہم کو مارا جاتا ہے اور کسی چیز کا ذکر کرنا جس کا اثر دوسری چیز پر بھی ظاہر ہو جیسے اللہ کا قول ضرب اللہ مثلا عبدا مملوکا یعنی اللہ ایک غلام کی مثال بیان کرتا ہے یہ اختلاف صرف لفظی ہے اس سے اس معنی پر اثر نہیں پڑتا جس کے لیے ضرب المثل کے لفظ کو اختیار کیا گیا جس کا مقصد نئے واقعہ کے پیش آنے پر مثال دینا جو کہ اس واقعہ کے مشابہ ہو۔ (۱۲)

مورد المثل سے مراد مثال کی وہ حالت ہے جس سے اس مثال کی ابتدا ہوئی ہو اور مضرب سے مراد یہ ہے کہ وہ نئی موافق حالت جس میں دونوں حالتوں کے تشابہ کی وجہ سے اس مثال کا استعمال ممکن ہوا ہو، یہ دونوں اصطلاحیں لغت میں بالکل نئی ہیں، ان دونوں میں سے کوئی بھی لغت کی کتابوں میں نہیں ملتی اور نہ یہ مثال کی پرانی کتابوں میں نظر آتی ہے قدیم کتابوں میں علماء مورد المثل کی جگہ پر (اصل ھذا لمثل کذا) اور مضرب المثل کی جگہ (ویضرب فی کذا) کہتے ہیں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان دونوں اصطلاحوں کو سب سے پہلے امام الزمخشری (م ۵۳۸ھ) نے استعمال کیا اور یہ بات انہوں نے

(مستقصی الامثال) کے مقدمہ میں مثال کی تعریف کرتے ہوئے کہی ہے وہ کہتے ہیں کہ مثال عربی زبان میں شبیہ اور نظیر کے معنی میں ہے، انہوں نے اس قول کو جو مروج ہوجائے جس سے مثال دی جائے مضرب اور پہلے دی گئی مثال کو مورد کہا ہے۔(۱۳)

بعض علماء کے نزدیک ضروری ہے کہ ہر مثال کا ایک مورد ہو اور مورد سے مراد وہ متعین واقعہ ہے جس کی وجہ سے مثال بنی یہ بات غلط اور ناممکن ہے، کیونکہ بہت سی مثالیں ایسی ہیں جو کسی پرانے واقعہ سے نہیں جڑی ہیں ان ہی مثالوں میں سے رسول اللہؐ سے روایت شدہ مثالیں ہیں اور وہ مثالیں جو اشعار سے اخذ کی گئی ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے وہ مثالیں بھی جو اصلاً حکمت ہیں پھر وہ زبان وزد خاص وعام ہوگئیں یہ مثالیں اور اسی طریقہ کی دیگر مثالیں کسی بھی متعین واقعہ سے نہیں جڑی ہیں اس لیے یہ قول غلط ہے کہ ہر مثال کے لیے ضروری ہے کہ وہ پرانے واقعہ سے جڑی ہو صحیح بات یہی ہے کہ موردالمثل سے مراد وہ حالت ہے جس میں پہلی مرتبہ اس کا استعمال کیا گیا ہو چاہے یہ مثال کسی واقعہ کی وجہ سے کہی گئی ہو یا نہیں۔

مثال کی لغوی و اصطلاحی تعریف سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مثال موجز، قیاسی اور خرافی ہوسکتی ہے:

۱۔مثال موجز کی تعریف: وہ مختصر اور عام ہوجانے والی بات جس کو نئے واقعہ سے تشبیہ دی جائے تو مثال کی اس قسم کی طرف ذہن فوراً متوجہ ہوجاتا ہے جب ہم مثل کا لفظ بولتے ہیں تو مثالوں کے جامعین بھی اس قسم کی مثالوں کو اہمیت دیتے، ان کو محفوظ اور جمع کرتے اور تشریح کرتے ہیں اور مورد اور مضرب تلاش کرتے ہیں، اس قسم میں وہ حکمتیں بھی داخل ہیں جو مختصر ہوتی ہیں اور لوگوں کے درمیان پھیل جاتی ہیں جیسے کہ "السر امانة" (راز امانت ہے) "العدة عطية" (وعدہ ہدیہ ہے) "العود احمد" (لوٹ آنا قابل تعریف ہے) "النساء حبالة الشيطان" (عورتیں شیطان کا پھندہ ہیں) اور "الحرب غشوم" (جنگ ظالم ہوتی ہے) اس طرح اس میں وہ شعری مثالیں ہیں جن میں حکمت کی بات ہو یا ان کا ایک مصرعہ یا مصرعہ کا ایک جز جو کلام میں شامل ہوجائے اور زبان زد ہوجائے لوگ اس سے مختلف زمانوں اور حالات میں مثال دینے لگیں جیسا کہ معن بن اوس کا شعر:

اعلمه الرماية كل يوم فلما اشتد ساعده رمانی

میں نے اس کو ہر روز تیر چلانے کی مشق کرائی پھر جب وہ ماہر ہوگیا تو اس نے مجھ پر ہی تیر چلا دیا۔

لبید بن ربیعہ کا شعر ہے:

الا كل شئی ما خلا الله باطل وكل نعيم لا محالة زائل

اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ ہر چیز باطل ہے اور ہر نعمت ضرور زائل ہونے والی ہے۔

یزید بن خداق کا شعر ہے:

هون عليک ولا تولع باشفاق فانما ما لنا للوارث الباقی

اپنے آپ پر نرمی کر اور بہت زیادہ نہ ڈر کیونکہ جو کچھ ہمارا ہے وہ باقی رہنے والے وارث کے لیے ہے۔

ایک اور شعر ہے:

المستجير بعمرو حين كربته كالمستجيرمن الرمضاءبالنار(۱۴)

اپنی کسی مصیبت و پریشانی کے وقت عمرو سے پناہ چاہنا ایسا ہے جیسا کہ آگ کے ذریعہ گرم ریت سے پناہ چاہنا۔

اسی میں مثال کی وہ قسم بھی ہے جو بروزن (افعل من) آئے اور جو تشبیہ میں مبالغہ پر دلالت کرے جیسے یہ اقوال (اجود من حاتم) ''حاتم سے زیادہ سخی'' (ابخل من مارد) ''مارد سے زیادہ بخیل'' (ابلغ من سحبان) ''سحبان سے زیادہ بلیغ'' (اعیا من باقل) ''باقل سے زیادہ بے پرواہ'' (اصدق من قطاة) ''قطاۃ سے زیادہ سچا'' (اطیش من فراشة) ''پروانہ سے زیادہ جلد باز''۔

۲۔مثال قیاسی کی تعریف: وہ قصہ گوئی یا توصیفی گفتگو جس کا مقصد تشبیہ کے ذریعہ دلیل قائم کرنا یا مثال دے کر موازنہ یا قیاس مقصود ہو یا پھر کوئی ایسے عمل کا تصور جس کے ذریعہ ادب سکھانا، مثال دینا، توضیح کرنا یا اس کو جسمانی شکل عطا کرنا مقصد ہو جس کا اپنے سابق سے موازنہ کیا جا سکے اور وہ کسی قصہ کی تلخیص ہو نہ اس کی طرف اشارہ اور نہ ہی اقتباس ہو بلکہ مکمل پورا قصہ یا مجازی صورت ہو۔(۱۵)

مثال کی یہ قسم قدیم عربی کتابوں میں معدوم بتائی جاتی ہے لیکن اس طرح کی مثالیں قرآن مجید اور اللہ کے رسولؐ کے کلام میں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں، جس کی تفصیل آگے آسکتی ہے۔

ان مثالوں کو جو قرآن اور حدیث کے طریقہ پر ہیں قیاسی مثالوں سے منسلک کردیا گیا ہے جیسے حضرت علی بن ابی طالب سے مروی ہے کہ دنیا کی مثال سانپ کی طرح ہے جس کا چھونا بہت نرم ہے اور ہلاک کردینے والا زہر اس کے پیٹ میں ہے اس کی طرف ناتجربہ کار جاہل آدمی پناہ لیتا ہے بہت زیادہ عقل منداس سے بچتا ہے (۱۶) اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں اپنے آپ پر قابو رکھنے والے عقل مند انسان کی مثال ایک بہت سخت بھاری بھرکم جسم کی طرح ہے جو سست رفتاری سے گرم ہوتا ہے اور ٹھنڈا ہونے میں اس سے بھی زیادہ وقت کا طالب ہوتا ہے۔

ابوعبداللہ محمد بن علی الحکیم الترمذی نے اس طرح کی مثالوں کا عمدہ مجموعہ جمع کیا ہے، وہ عالم کی مثال ان ستاروں اور نشانات سے دیتے ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے اور جن کے آثار پر چلا جاتا ہے اگر وہ غائب ہوجائیں تو لوگ حیرت زدہ ہوجائیں اور اگر ان کو چھوڑ دیں تو گمراہ ہوجائیں۔ انسان اور امام کی مثال ایک خیمہ کی طرح دی گئی ہے جو بغیر کھونٹے کے کھڑا نہیں ہوسکتا اور بقیہ کھونٹیوں کے بغیر ٹک نہیں سکتا جب بھی کھونٹی کھسکتی ہے تو کھونٹے کی کمزوری بڑھتی چلی جاتی ہے۔

۳۔ مثال خرافی کی تعریف : وہ مختصر اور مروج کلمات جو جانوروں کی زبانوں سے ادا کروائے گئے ہوں یا وہ بے سروپا قصے جن میں جانور آپس میں انسانوں کی طرح مصروف عمل نظر آتے ہوں، ان کا مقصد تفریح طبع اور اچھے اخلاق کے لیے آمادہ کرنا ہوتا ہے، اس قسم کے کلمات اور حکایات کے پس پردہ نہ کوئی واقعہ اور نہ ہی عقل مندی کی بات ہوتی ہے اسی وجہ سے علمائے لغت نے ان کا نام اکاذیب العرب، اکاذیب الاعراب یا رموز العرب رکھا ہے، اس قسم کے ادب کی ایجاد وترقی دیہاتی ماحول میں ہوتی تھی جو شہری لوگوں کی طرح مہذب ومثقف نہیں ہوتے اور جانوران کی زندگی کا اہم حصہ تھے۔ یہ خرافات بھی انہی کے اردگرد بنتی ہیں، اسی وجہ سے ادب عربی شعری ہو یا نثری اس طرح کے قصوں سے بھرا پڑا ہے، یہ سچائی عالمی ادب کا بھی حصہ ہے جس کو تفریح طبع، نصیحت اور اچھے اخلاق پر ابھارنے کا بہترین ذریعہ قرار دیا گیا ہے اس کو رمزی ادب کے طور پر بھی جانا جاتا ہے جس کو ادیب جانوروں اور جمادات کی زبانی گفتگو کرتے ہوئے استعمال کرتا ہے۔

عربی مثالوں کے اس خرافی ادب کے مطالعہ کے بعد اس کو دو قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔

۱۔ ایک وہ جس کو عربوں نے جانوروں کی زبانی بیان کیا ہے، کچھ مشہور مثالیں وہ ہیں جن کو

گوہ کی زبانی کہلوایا گیا ہے جن میں سے ایک خرگوش اور بھیڑیا کے کھجور کے بارے میں جھگڑے کی بات ہے اور بطور فیصلہ یہ جملہ سامنے آیا کہ جو ابتدا کرے وہ ظالم ہے آزاد کی مدد کی جانی چاہیے (۱۷)، اسی قسم میں وہ مثال بھی ہے جو سانپ کی زبانی سانپ اور کلہاڑی کی حکایت میں کہلوائی گئی ہے جبکہ سانپ نے آدمی سے کہا "میں تم سے کیسے دشمنی کرسکتا ہوں تمہاری کلہاڑی کا نشان میری پشت پر موجود ہے"۔(۱۸)

اسی قسم کی کچھ مشہور مثالیں یہ ہیں:

(انما اکلت یوم اکل الثور الاسود) "میں اسی دن کھالیا گیا تھا جس دن کالا بیل کھایا گیا"۔ (شحمتی فی قلعی) "میرے کان کا کنارہ میرے توشہ دان میں ہے"۔ (الحذر قبل ارسال السھم) "تیر چھوڑنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو"۔ (قد کنت قبلک مقرورة) "میں تم سے ملنے سے پہلے مطمئن تھا"۔ (لا احب تخدیش وجہ الصاحب) "میں پسند نہیں کرتا کہ تمہارا چہرہ نوچوں"۔(۱۹)

۲۔ دوسری قسم جسے عربوں نے خرافی ادب میں شمار کیا ہے، اس کی مثال ملاحظہ ہو:

(کرحم الفیل من الحمار) "ہاتھی کی رشتہ داری گدھے سے"، یہ مثال اس حکایت پر مبنی ہے جس کا خلاصہ ہے کہ یہ دونوں ایک دن کسی چراگاہ میں جمع ہوئے، ہاتھی نے گدھے کو ڈانٹ کر بھگا دیا، گدھے نے اس سے کہا تم مجھے کیوں بھگاتے ہو جبکہ میرے اور تمہارے درمیان تو رشتہ داری ہے، ہاتھی نے کہا کس قسم کی رشتہ داری، گدھے نے کہا میری دم تمہاری سونڈ کے مشابہ ہے، ہاتھی نے اس دلیل کو قبول کرلیا، ایسے ہی یہ کہ شتر مرغ سینگ تلاش کرنے گیا تو اس کے کان بھی چھن گئے یہ مثل ان کے اس قول پر مبنی ہے (کطالب القرن فجدعت اذنه) "سینگ کا طالب اپنے کان بھی کھو دیتا ہے"، اسی طرح قبر بجو اور بھیڑیے کی کہانی ہے جو قبر بجو کی حماقت پر دلالت کرتی ہے اسی وجہ سے عربوں نے مندرجہ ذیل مثالیں بنائیں، وہ کہتے ہیں: (احمق من الضبع) "قبر بجو سے بھی زیادہ احمق"۔ (احمق من ام عامر و ام طریق) "ام عامر اور ام طریق سے بھی زیادہ احمق"۔

مفضل الضبی نے سانپ اور کلہاڑی کی پوری حکایت کو مثال گردانا ہے، سانپ اور کلہاڑی کی مثال عربوں میں بہت مشہور ہے (۲۱)۔ اسی طرح الجاحظ بھی ایک مثال کے ذریعہ اپنی یہی رائے ظاہر

کرتا ہے، وہ مثال اس طرح ہے ''ایک بوڑھے شخص نے چڑیوں کے لیے جال بچھایا وہ اس جال میں پھنس گئیں پھر اس بوڑھے کو ٹھنڈک لگی جب جب بھی وہ جال کے پاس آتا جو چڑیا قریب ہوتی اس کو پکڑ لیتا اور اس کے بازو تراش کر اس کو اپنے جھولے میں ڈال دیتا جب شمالی سرد ہوا اس کے چہرے پر پڑی تو اس کے آنسو بہنے لگے چڑیوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا کہ تم کو فکر مند نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ وہ بوڑھا نیک اور رحم دل ہے اس کے آنسو بہہ رہے ہیں اس پر ان میں سے ایک چڑیا نے کہا کہ اس کے آنکھ کے آنسوؤں کی طرف نہ دیکھو بلکہ اس کے کام کی طرف دیکھو جو وہ کر رہا ہے''۔(۲۲)

خرافی مثالوں کے ماہرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ پوری پوری حکایت مثال شمار نہیں کی جائے گی بلکہ اس میں سے وہ الفاظ لے لیے جائیں گے جن کا رواج پڑ جائے اسی لیے سانپ اور کلہاڑی والی حکایت سے صرف سانپ کا قول لیا گیا ہے کہ (کیف اعاود ک و ھذا اثر فاسک) ''میں تم سے کیسے دشمنی کر سکتا ہوں اور یہ تمہاری کلہاڑی کا نشان میری پشت پر ہے'' اسی طرح دوسری مثالوں میں بھی مروجہ کلمات ہی کو لیا جائے گا۔

ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ اگر پوری کی پوری خرافی حکایت مثال شمار کی جائے تو یہ قیاسی مثال کی قسم میں سے ہوگی نہ کہ خرافی، اس طرح کی مثالیں مشہور کتاب ''کلیلہ ودمنہ'' میں بہت ہیں، صرف مروجہ کلمات کو مثال مانا جائے تو پھر یہ مختصر مثال میں شمار کی جائیں گی۔

مثال بھی فن کلام میں سے ایک فن ہے، اس میں کتنا ہی اختلاف وتنوع کیوں نہ ہو وہ ایک نام کے تحت ہی آتی ہیں اس لیے کہ کلام میں ان کا بکثرت استعمال کیا جاتا ہے اور متعدد اسالیب کلام میں ان کا دخل ہے۔(۲۳)

اسی وجہ سے محققین نے متعدد اعتبار سے مثالوں میں فرق وامتیاز کیا ہے یعنی اسالیب کے تنوع کے اعتبار سے اور مثال دینے والوں کے اختلاف کے اعتبار سے بھی بہت سی مثالیں منظوم ہیں، بہت سی نثری ہیں، خاص طور پر عہد عباسی میں اکثر شعرا اپنے کلام میں مثالوں کو پیش کرتے ہیں اس وجہ سے ان کا یہ طرز عمل معیوب بھی قرار دیا گیا، متعدد کتابیں شعری مثالوں کی لکھی گئیں نثری مثالوں پر اگر المیدانی کی مجمع الامثال کی تحقیق کی جائے تو تقریباً اسکا چوتھائی حصہ ان مثالوں پر مشتمل ہے جو شعروں سے لی گئی ہیں۔(۲۴)

ابن رشیق قیروانی کا قول کہ ''کلام عرب میں عام ہونے والی مثالیں شعری اور نثری دونوں ہیں''، بعض لوگوں نے مثالوں کے درمیان لمبی اور چھوٹی ہونے کے اعتبار سے بھی فرق کیا ہے، حسن بن عبدالرحمٰن رامہرمذی کا خیال ہے کہ قرآنی مثالیں جاہلیت کے مثالوں کے مقابلہ میں کافی طویل ہیں۔

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ قرآنی مثالیں طویل بھی ہیں مختصر بھی۔(۲۵)

بعض محققین نے مثال دینے والے یا کسی طبقہ وقوم کے حساب سے فرق کیا ہے اور انہی کی طرف مثالوں کو منسوب کردیا ہے جیسے امثال الرسولؐ، امثال الصحابہؓ، ادباء، علماء، حکماء، عوام اور خواص کی مثالوں میں بھی فرق وامتیاز کیا گیا ہے، اسی طرح عرب وعجم کی مثالیں یا کسی طبقہ اور قوم جس سے وہ مثال نکلی ہے یا مثالوں کی صنف میں الگ الگ ادوار اور زمانوں کے حساب سے بھی فرق کیا گیا ہے۔(۲۶)

فہرست مآخذ

(۱) التھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون، ۴/ ۱۳۴۴۔(۲) ابن العربی: شرح ابن العربی علی الترمذی، ۱۰/ ۲۹۵۔ (۳) المیدانی: کتاب الجمہرۃ علی ہامش الامثال، ص ۱۰۔(۴) ابوہلال العسکری: کتاب الجمہرۃ علی ہامش الامثال، ص ا۔۵۔(۵) البکری: فصل المقال، ص ۵۔(۶) الجاحظ: الحیوان، ۳/ ۲۶۷، ۵/ ۱۱۹۔(۷) السیوطی: المزہر، ا/ ۴۸۷۔(۸) عبدالقاہر الجرجانی: اسرار البلاغۃ، ص ۹۲۔(۹) السکاکی: مفتاح العلوم، ص ۱۸۷۔(۱۰) الزمخشری: الکشاف، ا/ ۸۵۔(۱۱) البکری: فصل المقال، ص ۹۵۔(۱۲) الراغب الاصفہانی: المفردات فی غریب القرآن، ص ۷۵۔(۱۳) الزمخشری: مستقصی الامثال، ا/ ۵۵۔(۱۴) الاصفہانی: الاغانی، ۲۰/ ۱۳۲۔(۱۵) د۔عبدالمجید عابدین: الامثال فی النثر العربی القدیم، ص ۱۵۸۔(۱۶) الشریف الرضی: نہج البلاغۃ، ۲/ ۳۳۳ (تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم)۔ (۱۷) مفضل ابن سلمہ: الفاخر، ص ۶۷۔(۱۸) ابوعکرمہ الضبی: الامثال، ص ۸۴ و ۸۵۔(۱۹) المیدانی: مجمع الامثال، ۲/ ۲۴۰۔(۲۰) حمزہ بن الاصبہانی: الدرۃ الفاخرۃ فی الامثال السائرۃ، ۲/ ۳۶۸۔(۲۱) ابوعکرمہ الضبی: الامثال، ص ۸۵۔ (۲۲) الجاحظ: الحیوان، ۵/ ۲۳۸ و ۲۳۹۔(۲۳) ابوہلال العسکری: مقدمہ جمہرۃ الامثال، ص ۱۲۔(۲۴) المیدانی: مجمع الامثال، ا/ ۱۷، ۱۸، ۲۱۔(۲۵) ابن رشیق القیروانی: العمدہ فی محاسن الشعر، ا/ ۲۸۔(۲۶) الثعالبی: التمثیل والمحاضرۃ، ص ۳۵۔

روداد سمینار

”دارالمصنّفین، اس کے معمار، رفقا اور خدمات“

۱/۲ /نومبر ۲۰۱۵ء

کلیم صفات اصلاحی

الحمد للہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی نے اپنی زندگی کے سو سال پورے کر کے دوسری صدی میں قدم رکھ دیا ہے۔ اس نے یہ طویل سفر اللہ کے فضل، بانی ادارہ علامہ شبلی نعمانی کے اخلاص نیت، اس کے معماروں کی پر خلوص جد و جہد، اس کے بوریہ نشین رفقا کی قناعت اور اس سے وابستہ دوسرے خدمت گزاروں کی بے لوث خدمت کے سبب طے کیا۔ سخت نامساعد و ناموافق حالات کے باوجود ادارہ نے تصنیف و تالیف اور علم و تحقیق کا جو بلند پایہ معیار قائم کیا اس کا وزن اور وقار پوری دنیائے علم و ادب میں محسوس کیا گیا۔ اس کے طرز و اسلوب کی اتباع کی گئی۔ اس کی بعض تصنیفات کے دنیا کی مختلف زبانوں انگریزی، عربی، پشتو، ملیالم، ہندی، فارسی میں ترجمے کیے گئے۔ اس طرح اس کی مقبولیت و شہرت عالم گیر ہوگئی۔ بڑے بڑے محققین، ادبا، شعرا اور سیاسی قائدین اس مرکز علم و فن کی زیارت کو اپنے لیے مایۂ فخر سمجھنے لگے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۲۰۱۴ - ۲۰۱۵ء شبلی اور دارالمصنّفین صدی کا سال تھا۔ اسی مناسبت سے اس کو صدی تقریبات کے سال کے طور پر منانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ چنانچہ ۲۹ /نومبر تا یکم دسمبر ۲۰۱۴ء کو نہایت تزک و احتشام سے ایک سہ روزہ بین الاقوامی سمینار سے اس کا آغاز ہوا جس کا افتتاح نائب صدر جمہوریہ ہند عالی جناب محمد حامد انصاری صاحب نے فرمایا۔ اس میں سعودیہ، ترکی، مصر، ابوظبی، ملیشیا، پاکستان، امریکہ اور انگلینڈ وغیرہ کے ممتاز اسکالرز نے شرکت کی۔ اس سمینار کی گونج اطراف عالم میں

سنی اور محسوس کی گئی۔اس کی مفصل روداد معارف میں موجود ہے۔صدی تقریبات کے تحت اس سمینار کے علاوہ اس سال اس مناسبت سے اور بھی متعدد کام ہوئے۔مثلاً متعدد علمی و ادبی کتابیں شائع کی گئیں، حالی پر ایک روزہ سمینار کیا گیا،کل ہند مسابقۂ سیرت نویسی کا انعقاد کیا گیا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہ سال دارالمصنّفین کا بھی صدی سال تھا اور منصوبہ کے مطابق بین الاقوامی سمینار کا موضوع علامہ شبلی اور دارالمصنّفین دونوں ہی تھے۔مگر مختلف اسباب کی وجہ سے بیشتر مقالہ نگاروں نے صرف شبلی پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی جس کے سبب دارالمصنّفین کے معماروں اور رفقا و خدمات کے حصہ کو مناسب توجہ نہیں مل سکی۔ چنانچہ اس کمی کی تلافی کے مقصد سے اس موضوع پر ایک مستقل سمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا اور یہ سمینار ''دارالمصنّفین،اس کے معمار، رفقاء اور خدمات'' کے موضوع پر ۱۔۲/نومبر ۲۰۱۵ء کو منعقد ہوا۔الحمدللہ یہ علمی سمینار بھی اپنے مقاصد اور مقالات کے تنوع کے لحاظ سے بھرپور اور کامیاب رہا۔اس میں کل ۵۰ مقالوں کی تلخیص موصول ہوئی اور اطراف ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اور علمی مراکز سے کل ۴۲ اصحاب علم و دانش نے اس میں شرکت کی۔

افتتاحی اجلاس یکم نومبر کی صبح ساڑھے نو بجے پروفیسر محسن عثمانی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ پروفیسر خالد محمود مہمان خصوصی تھے۔کلیدی خطبہ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی اور خطبۂ استقبالیہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ڈائریکٹر دارالمصنّفین نے پیش کیا۔اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ مولانا عمیر الصدیق ندوی دریابادی نے انجام دیا۔تلاوت حافظ عبدالرحمان قمر عباسی نے کی۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا ''ہم نے ایک برس قبل شبلی صدی تقریبات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ آج اپنے اختتام کو پہنچنے والا ہے۔انھوں نے کہا کہ اس سلسلہ کی تمام تقریبات الحمدللہ نہایت کامیاب رہیں۔انھوں نے مزید کہا کہ شبلی کا جو وژن اور فکر تھا، ایک صدی گزر جانے کے باوجود اسے اپنے تمام تر مضمرات کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ابھی باقی ہے۔ضرورت ہے کہ اس کی مکمل بازیافت کی جائے۔اپنے محدود وسائل کے باوجود ادارہ نے علم و ادب کی جو خدمت انجام دی ہے اور اس کے معماروں، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی وغیرہ نے جس اخلاص، بےلوثی اور تندہی سے اس کی خدمت کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔آج ضرورت ہے کہ ان کے کاموں اور منصوبوں کا جائزہ لیا جائے اور نئی صدی کی ضروریات

اور تقاضوں کے مطابق مستقبل کے لیے از سر نو منصوبہ بندی کی جائے۔ یقیناً یہ کام آپ کے تعاون اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت کے بغیر ممکن نہیں۔'' اس کے بعد شبلی صدی تقریبات کے تحت ادارہ کی جانب سے شائع ہونے والی کتابوں، رسائل شبلی، مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں (مجموعہ مقالات سمینار) مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی۔ یہود اور قرآن مجید (مولانا ضیاء الدین اصلاحی) مرتبہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور متاع رفتگاں (وفیات مولانا شاہ معین الدین ندوی) مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا اجرا ہوا۔ شبلی صدی تقریبات کی مناسبت سے ایک کل ہند مسابقہ سیرت نویسی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کے نتائج کا اعلان اس کے کنوینر کی حیثیت سے راقم سطور نے کیا۔ اس کے بعد پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب نے اپنا کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اس میں انہوں نے کہا کہ جس قوم کو اپنی تاریخ کا علم نہ ہو وہ دنیا کے سامنے باوقار حیثیت سے قائم نہیں رہ سکتی۔ شبلی اسی نظریہ کے تحت مسلمانوں کو اپنی تاریخ سے وابستہ کرنا چاہتے تھے۔ ماضی سے رشتہ کی استواری کی جو بزم علمی انہوں نے سجائی تھی اس کا مقصد یہی تھا۔ ان کے بعد ان کے تلامذہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی وغیرہ نے شبلی کے خوابوں کو نہ صرف یہ کہ شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش کی بلکہ ان کے کاموں میں اضافہ کیا پھر اسی چراغ سے چراغ جلتا رہا اور آج پورا ہندوستان بلکہ عالم اسلام اس سے فیض حاصل کر رہا ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ علامہ شبلی نے محض ۵۷ برس کی عمر میں جو کام کیے وہ حیرت انگیز ہیں۔ تعلیم ان کی زندگی کا روشن ترین باب ہے اور ان کے تعلیمی نظریات کو آج بھی اپنانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے تعلیم کو تحریک کی صورت عطا کی تھی۔ قوم وملت کے تئیں ان کی ہمدردی اور درد کو دیکھنا ہو تو ان کے خطوط کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے بعد شاگردوں کی جو ٹیم تیار کی وہ بھی بے مثال ہے۔ ان کے شاگردوں نے استاد کے خواب کو پورا کرنے کے لیے خود کو مٹا دیا۔ ایسی مثالیں کمیاب ہیں۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ شبلی اکیڈمی ملک کا عظیم الشان ادارہ ہے۔ اس کی عطر بیزیوں سے ہندوستان کی پوری علمی وتحقیقی دنیا معطر ہے۔ اس کے بعد پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور یہ خوش خبری سنائی کہ ادارہ کی اہم مطبوعات رحمت عالم، الفاروق، سیرت عائشہ، مذہبی رواداری وغیرہ جیسی تقریباً ۲۷ کتابوں کے ہندی اور انگریزی ترجمے ہو چکے ہیں۔ بعض پر کام ہو رہا ہے۔

انشاءاللہ جلد ہی وہ آپ کے ہاتھوں میں ہوں گے۔

اس کے بعد علمی اجلاس کا آغاز پونے بارہ بجے ہوا جس کی صدارت پروفیسر شہپر رسول اور نظامت مولانا اشہد رفیق ندوی نے کی۔ اس نشست میں پروفیسر عبدالقادر نے انگریزی میں ''فارسی زبان وادب اور مولانا سید سلیمان'' پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے مقالات سلیمانی جلد سوم۔ تنقیدی جائزہ، پروفیسر علی احمد فاطمی نے دارالمصنّفین۔ چند تاثرات، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے دارالمصنّفین کی قرآنی خدمات، ڈاکٹر محمد شارق نے دارالمصنّفین کے معمار اول مولانا سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات، جناب سلمان فیصل نے ہندوستانی قومیت اور دارالمصنّفین، محمد اسماعیل اصلاحی نے دارالمصنّفین کی غیر فرقہ وارانہ حیثیت اور اس کا سلسلہ مذہبی رواداری پر مقالات پیش کے۔

اس کے بعد ۶ بجے بعد نماز مغرب علمی اجلاس کی دوسری نشست شروع ہوئی۔ جس کی صدارت پروفیسر ظفر احمد صدیقی اور نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ اس میں مولانا تقی الدین ندوی کا مقالہ مولانا محمد اویس نگرامی ندوی، مولانا فیروز اختر ندوی نے پیش کیا۔ پروفیسر توقیر عالم فلاحی نے سید صاحب اور سیرت النبی میں قرآنی استدلال، ڈاکٹر محمد عتیق الرحمان نے مولانا حاجی معین الدین ندوی اور ان کی علمی خدمات، ڈاکٹر صفدر امام قادری نے اردو کے سوانحی ادب کے فروغ میں دارالمصنّفین کا حصہ، ڈاکٹر علاء الدین نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ نگاری اور دارالمصنّفین، کلیم صفات اصلاحی نے ڈاکٹر محمد عزیر اور دارالمصنّفین، مولانا اشہد رفیق ندوی نے دارالمصنّفین کے وہ منصوبے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے اور شاہ نواز فیاض نے لسانیاتی ادب اور دارالمصنّفین کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔

اس کے معاً بعد تیسرا اجلاس پروفیسر احمد محفوظ کی صدارت اور شاہ نواز فیاض کی نظامت میں منعقد ہوا۔ اس میں پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے تاریخ صقلیہ اور تاریخ اندلس کے مصنف مولانا ریاست علی ندوی، ڈاکٹر عطا خورشید نے ڈاکٹر محمد عزیر۔ دارالمصنّفین کے ایک اہم رفیق، جناب عارف عزیز نے دارالمصنّفین اور بھوپال، مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی نے مقالات سلیمان حصہ اول۔ ایک مطالعہ، ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے دارالمصنّفین اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم، ڈاکٹر احسان اللہ فہد نے سید سلیمان ندوی کی قرآنی خدمات، ڈاکٹر محمد اکرم السلام اعظمی نے مولانا سعید انصاری اور ان کی علمی خدمات، ڈاکٹر عمیر منظر نے دارالمصنّفین اور ندوۃ العلما۔ ایک جائزہ، مولوی فضل الرحمٰن اصلاحی

نے مولانا فراہی کی کتابوں کی اشاعت میں دارالمصنّفین کا حصہ کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

چوتھا علمی اجلاس ۲؍نومبر کو صبح نو بجے شروع ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی اور نظامت ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے کی۔ اس میں پہلے ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کا مقالہ مولانا سید سلیمان ندوی اوران کی قرآنی خدمات کے نام سے سامعین کو پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد پروفیسر خالد محمود نے دارالمصنّفین کی اولین اشاعت۔ مکاتیب شبلی، پروفیسر قمرالہدیٰ نے سید سلیمان ندوی۔ بعض لسانی مباحث، مولانا ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی کا مقالہ ''مولانا مجیب اللہ ندوی۔ ایک جامع و ہمہ گیر شخصیت'' کے عنوان سے مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی نے پیش کیا، جناب شکیل احمد انور نے دارالمصنّفین اور حیدرآباد، مولانا عمیر الصدیق ندوی نے سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم، پروفیسر احمد محفوظ نے اردو تنقید کے فروغ میں دارالمصنّفین کا حصہ، ڈاکٹر عبداللہ امتیاز نے مولانا سید ابوظفر ندوی بحیثیت مورخ، ڈاکٹر محمود مرزا عبدالرب نے دارالمصنّفین کی عربی خدمات کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ مولانا فریدالدین ندوی کا مقالہ عربی میں تھا جس کو جامعہ اسلامیہ مظفر پور کے استاذ مولانا رافع ندوی نے پیش کیا۔ اس کے علاوہ اس نشست میں شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقدہ شبلی سمینار میں پیش کیے جانے والے مقالات کا مجموعہ ''شبلی نعمانی۔ شخصیت اور عصری معنویت'' اور حالی اور شبلی پر ''فکر و نظر'' علی گڑھ کے خصوصی شمارہ کی رسم اجرا بھی انجام پائی۔

مقالات کی آخری نشست مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی کی صدارت اور مولانا محمد اکرم السلام اعظمی کی نظامت میں منعقد ہوئی۔ اس میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے خطبات مدراس۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک شاہکار، پروفیسر شہپر رسول نے دارالمصنّفین کی اہم تصنیف۔ کلیات شبلی ڈاکٹر شباب الدین نے شبلی کے ادبی جانشین مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ڈاکٹر محمد عارف عمری نے اراضیِ دارالمصنّفین کے واقفین، مولانا نعیم الدین اصلاحی نے مولانا ابوالجلال ندوی اور قرآنیات، مولانا ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی نے تصوف کے مطالعہ میں دارالمصنّفین کی خدمات، مولانا محمد فرمان ندوی نے دارالمصنّفین اور ندوۃ العلما کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔

اختتامی اجلاس کی صدارت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن الاعظمی اور نظامت مولانا ڈاکٹر محمد عارف

عمری نے کی۔ یہ مجلس تاثرات کے لیے خاص تھی اور تاثرات کے لیے پروفیسر قمر الہدیٰ، ڈاکٹر صفدر امام قادری اور ڈاکٹر شباب الدین صاحب کو مدعو کیا گیا۔ ان حضرات نے اس کامیاب سمینار کے انعقاد پر پروفیسر ظلی صاحب اور اراکین دارالمصنّفین کو مبارک باد پیش کی اور متعدد تجویزیں اور مشورے دیے۔ صدارتی خطاب میں مولانا سعید الرحمن الاعظمی صاحب نے فرمایا کہ یہ سمینار اپنے مقاصد، مقالات کے تنوع اور اہل علم وصاحب نظر مندوبین کی شرکت کے لحاظ سے بہت کامیاب ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ دارالمصنّفین اپنی ظاہری، باطنی اور فکری وتحقیقی ہر لحاظ سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی فعال قیادت نے یقیناً ادارہ کے وسعت تعارف اور مقبولیت میں اضافہ کردیا ہے اور یہ بڑے خوش آئند مستقبل کی بشارت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو مزید رفعتوں اور ترقیوں سے نوازے اور اسی طرح یہ علم وفکر اور تحقیق وآگہی کی شمعیں روشن کرتا رہے۔

آخر میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے تمام حاضرین، مندوبین، کارکنان دارالمصنّفین اور دوسرے خدمت گزاروں کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ جن کے سرگرم اور فعال تعاون کے بغیر اس طرح کے کسی کامیاب پروگرام کا انعقاد ممکن نہیں۔ انہوں نے ان جہات اور منصوبوں کا ذکر کیا جن پر نئی صدی میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ادارہ کو ہر قسم کی آزمائش سے بچائے۔ اس کو آباد، شاد اور برقرار رکھنے کے لیے آپ کے تعاون اور حمایت کی ضرورت ہے۔

اخبار علمیہ

''مذہب اسلام پر پابندی''

افریقی ملک انگولا کی کل آبادی ڈھائی کروڑ ہے۔ان میں مسلمانوں کی تعداد ۸۰ سے ۹۰ ہزار ہے۔مسلمانوں کی اکثریت لبنان نژاد مہاجرین پر مشتمل ہے۔خبر ہے کہ ملک کے موجودہ صدر جوزایڈ وارڈ نے گزشتہ دنوں وہاں اسلام پر پابندی کا اعلان کیا ہے ۔ اس سے قبل وزیر ثقافت کروزسلوا نے بھی اعلان کیا تھا کہ چونکہ ملک میں اسلام کو قانونی درجہ حاصل نہیں ہے اور اسلامی نظریات وتعلیمات ملکی رسوم اور قبائلی ثقافت سے میل نہیں کھاتے ،اس لیے اسلام پر پابندی کا فیصلہ کیا گیا ہے اور جب تک اس سلسلہ میں کوئی دوسرا سرکاری حکم نہیں آجاتا مسجدوں کو نماز کے لیے کھولا نہیں جائے گا۔تجزیہ نگاروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ چونکہ افریقی ممالک میں اسلام اپنے پاؤں تیزی سے پسار رہا ہے اور روز بروز اس کی مقبولیت میں اضافہ ہورہا ہے اس لیے اس کا راستہ بند کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ۔حکومت کے اس اقدام کے خلاف ایسوسی ایشن آف مسلمز ڈیولپمنٹ نے سخت احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ فیصلہ انسانوں کی آزادی اور بنیادی حقوق کے خلاف ہے۔اس معاملہ کو اقوام متحدہ میں پیش کیا جائے گا اور اس کے خلاف تحریک چلائی جائے گی ۔ اس طرح انگولا دنیا کا واحد ملک بن گیا جہاں اسلام پر پابندی ہے۔

(افکارملی،نومبر ۲۰۱۵ء)

''سعودی عرب میں پابندی''

سعودی عرب کی وزارت داخلہ نے پچاس ایسے ناموں پر پابندی عاید کی ہے جو وہاں کی مذہبی اور ثقافتی شناخت وحیثیت سے مطابقت نہیں رکھتے ۔حکومت کی طرف سے والدین کو مطلع کیا جائے گا کہ ان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے بچوں کو لنڈا، الانس، ایلین یا بن یامن کے نام سے پکاریں۔بن یامن حضرت یعقوبؑ کے بیٹے تھے لیکن اس وقت یہ اسرائیلی وزیر اعظم کا نام بھی ہے۔ناموں کی جو فہرست وزارت داخلہ کے ذریعہ تیار کی گئی ہے ان سے یا تو اسلاف کی بے حرمتی و بے ادبی ظاہر ہوتی ہے یا پھر وہ غیر اسلامی اور غیر عربی ہیں یا تو ان ناموں سے سعودی ثقافت و مذہب

کی مخالفت کا اظہار ہوتا ہے۔ رپورٹ میں اپنے اس اقدام کو صحیح ثابت کرنے اور لوگوں کو مطمئن کرنے کے اور بھی دلائل وزارت داخلہ نے دیے ہیں۔ بہر حال ناپسندیدہ ناموں کی جو فہرست تیار کی گئی ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں: ملک (فرشتہ) عبدالعاطی، عبدالناصر، مصلح، بن یامن، نارس یاراستوا، لولانڈ تلاج بارا، عبدالنبی، عبدالرسول، المملکہ، مالکہ، تبارک، راما، مالین، ایلین، ملکتینا، مایا، لنڈارانڈا، بسمالا، جبریل، عبدالمعین ابرار ایمان، نبیہ وغیرہ۔

(ٹائمس آف انڈیا، ۸؍نومبر ۲۰۱۵ء)

''مرد و عورت کے عدم توازن کے سبب مشترکہ بیوی کی تجویز''

چین میں مرد و عورت کی آبادی میں توازن نہیں ہے اور وہاں ۱۱۸ لڑکوں پر صرف ۱۰۰ لڑکیاں ہی ہیں۔ اس عدم اعتدال کے اسباب میں فی گھرانہ ایک بچہ کی پالیسی، لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دینے کا عمل اور دولت مند مردوں سے شادی رچانے کے لڑکیوں کے رجحان میں اضافہ اہم سبب قرار دیا جارہا ہے۔ اس صورت حال کی بنا پر ماہرین کا خیال ہے کہ ۲۰۲۰ء تک چین میں غیر شادی شدہ مردوں کی تعداد تین سے چار کروڑ تک پہنچ سکتی ہے۔ ایسے میں چواچیانگ یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر سیے زواشی نے انٹرنیٹ پر اپنے ایک مضمون میں مشترکہ بیوی کی غیر اخلاقی اور غیر قانونی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس مسئلہ کا حل یہی ہے۔ اس لیے کہ اگر ایک شوہر۔ ایک بیوی کے معاشرتی معاہدہ پر ہم ثابت قدم رہیں گے اور تین کرور کنواروں کو خواتین سے دور رکھیں گے تو وہ زنا بالجبر اور قتل و غارت گری کی جانب متوجہ ہو جائیں گے۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ یہ کوئی انہونی یا ناممکنات میں سے نہیں ہے کیونکہ چین کے بعض دور دراز علاقوں میں ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں متعدد بھائی آپس میں مل کر ایک خاتون سے شادی کر لیتے ہیں اور ان میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا اور وہ آپس میں ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ پروفیسر مذکور کی اس تجویز پر متعدد ردعمل بھی سامنے آرہے ہیں۔ چینی ویب سائٹ کے ایک صارف نے کہا کہ خواتین کا واحد مقصد وارث پیدا کرنا اور آبادی کے مسئلہ کے حل کے لیے کئی مردوں کے ساتھ تعلق قائم کرنا ہے تو ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق ہے؟ حقوق نسواں کے چینی علم بردار جینگ ژیانگ کا کہنا ہے کہ یہ ایک نہایت بے تکی

تجویز ہے اور اس میں خواتین کی خواہشات کے حقوق کو بالکل نظرانداز کیا گیا ہے۔

(بی بی سی اردو ڈاٹ کام، ۱۶/ اکتوبر ۲۰۱۵ء)

''اسپلٹ ویو''

گاڑیوں میں نئی نئی ٹیکنالوجی اور سہولت کا متعارف کرانا کمپنیوں کا عام مشغلہ ہے۔ جرمن کے ایک کارساز ادارے نے ''اسپلٹ ویو'' کیمرہ ٹیکنالوجی متعارف کرایا ہے جس کی مدد سے ڈرائیور کسی بھی موڑ پر پہنچنے سے پہلے ہی دائیں بائیں سے آنے والے لوگوں کو دیکھ سکے گا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اس ٹیکنالوجی سے ٹریفک حادثات میں خاطر خواہ کمی آئے گی۔

(اردو سائنس، دہلی، ستمبر ۲۰۱۵ء)

''نظام شمسی کا سب سے بعید المسافت سیارہ''

ماہرین فلکیات نے نظام شمسی میں اب تک کے سب سے بعید المسافت سیارہ کی نشان دہی کی ہے۔ سورج سے اس کا فاصلہ ۱۵/ ارب کلومیٹر ہے۔ اس سے قبل سب سے زیادہ فاصلہ والے سیارہ کو ''ایریس'' کا نام دیا گیا تھا جو سورج سے پانچ ارب ۷۰ کروڑ کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا۔ جاپان کی سیوبورو ٹیلی اسکوپ سے حاصل کی گئی معلومات کے مطابق حالیہ دریافت شدہ سیارہ پلوٹو اور سورج کے فاصلہ سے بھی تقریباً تین گنا زیادہ دور ہے۔ اس کی ساخت برف کے مانند ہے۔ اس کو V774104 کا نام دیا گیا ہے۔ ماہرین نے اس کی ساخت و ہیئت کے متعلق معلومات کے لیے مزید معائنہ کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس نئی دریافت کا اعلان امریکی فلکیاتی سوسائٹی کے ۴۷ویں سالانہ اجلاس میں کیا گیا ہے۔

(اخبار مشرق، ۱۳/ نومبر ۲۰۱۵ء)

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

علامہ فخرالدین مہکری نائطی

بنگلور

۲۶رنومبر ۲۰۱۵ء

محترمی ومکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''معارف'' نومبر ۲۰۱۵ء کے شمارے میں راقم الحروف کے مضمون ''جنوبی ہند کے ایک گمنام مصلح وداعی حضرت علامہ فخر الدین مہکری نائطی بےخود ویلوری'' سے متعلق محترم ڈاکٹر اجمل اصلاحی صاحب (ریاض،سعودی عرب) کا مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں فاضل مراسلہ نگار نے مضمون کی تمہید میں قوم نوائط سے متعلق'' گلستان نسب'' (مرقومہ ۱۲۳۰ھ) کے حوالے سے تحریر کردہ عبارت پر یہ کہتے ہوئے اعتراض کیا ہے کہ ''اصل عربی عبارت کا ماخذ نواب قادر عظیم خان بہادر مدراسی کی کتاب'' گلستان نسب'' (مرقومہ ۱۲۳۰ھ) ہے۔یہیں سے ''تاریخ النوائط'' کے مصنف نے اسے نقل کیا ہے اور تاریخ النوائط کے حولے سے فاضل مضمون نگار نے۔''تاریخ طبری'' نہ مضمون نگار نے دیکھی اور نہ تاریخ النوائط کے مصنف نے۔معلوم نہیں گلستان نسب کے مصنف نے کسی ماخذ کا حوالہ دیا ہے یا نہیں مگر یہ بات قطعی ہے کہ تاریخ طبری انھوں نے بھی نہیں دیکھی، کیونکہ اس طرح کی کوئی عبارت تاریخ طبری میں موجود نہیں ہے۔اس عبارت کے بعد موصوف نے اپنی وسعت مطالعہ کا اظہار فرماتے ہوئے''سبحۃ المرجان''،''ابجد العلوم''اور''نزہۃ الخواطر'' کا نہ صرف ذکر کیا بلکہ یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ''تاریخ طبری ہی نہیں بعد کی مشہور کتب تاریخ مثلاً ابن اثیر کی الکامل،تاریخ ابن خلدون اور البدایۃ والنہایہ بھی نوائت یا نوائط کے ذکر سے خالی ہیں''۔راقم اپنی جانب سے مذکورہ اعتراضات و اشکالات کا جواب دینے کی بجائے''تاریخ النوائط'' (مولف نواب عزیز جنگ بہادر ولاؔ،مطبوعہ عزیز المطابع،حیدرآباد دکن ۱۳۲۲ھ) میں شامل شمس العلماء علامہ شبلی نعمانیؒ کی موقر و نایاب تقریظ من وعن نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہے،تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ یہ

اعتراض علامہ شبلی نے اسی وقت اٹھایا تھا اور اس کا جواب بھی خود ہی دے دیا تھا۔

تقریظ

از: شمس العلماء علامہ شبلی نعمانیؒ صاحب

قدیم زمانہ میں شخصی سلطنت کے اصول نے فن تاریخ پر یہ اثر کیا تھا کہ تاریخی تصنیفات میں جو کچھ لکھا جاتا تھا صرف سلاطین کے واقعات اور حالات ہوتے تھے۔ ملک اور قوم کے حالات سے مطلق بحث نہیں ہوتی تھی، یہی سبب ہے کہ سیکڑوں ہزاروں تاریخوں کو پڑھ کر اگر پتہ لگانا چاہو کہ اس زمانہ کا تمدن اور تہذّب و معاشرت کیا تھی تو تم کو بالکل ناکامی ہوگی لیکن اب مغربی تہذیب کے اثر نے یہ حالت بالکل بدل دی ہے۔ آج سب سے زیادہ جس چیز کی تلاش ہے وہ قومی اور ملکی معاملات ہیں اور موجودہ تصنیفات میں خصوصیت کے ساتھ ان ہی باتوں کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ انداز صرف زمانہ حال کی تاریخ میں نبھ سکتا ہے کیونکہ قدیم ذخیروں میں یہ سامان بہت کم موجود ہے اس لیے آج کتنی ہی کوشش اور کاوش کی جائے پوری کامیابی نہیں ہوسکتی۔ ایسی حالت میں اگر کوئی مصنف غیر معمولی دیدہ ریزی سے اس قسم کے کچھ واقعات بہم پہنچالے تو بے انتہا قدردانی کا مستحق ہوگا ہم جس کتاب پر ریویو کر رہے ہیں، اسی قسم کی ایک کامیاب تصنیف ہے۔ ابتدائے اسلام سے عرب وعجم کے سیکڑوں خاندان ہندوستان میں آکر آباد ہوئے جن کے کارنامے چہرہ تاریخ کے خط وخال ہیں، ان ہی میں نوایط کا خاندان ہے جو آج سے سیکڑوں برس پہلے ہندوستان میں آیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ مدراس اور دکن کے حصوں میں پھولا پھلا۔ آج بھی یہ خاندان امتیاز کے ساتھ قائم ہے۔ اور اس کی یادگاریں ان ممالک میں ہر جگہ ایک خاص نام ونمود رکھتی ہیں۔ یہ کتاب اسی خاندان کے حالات میں نواب عزیز جنگ بہادر کی تصنیف ہے۔ اگرچہ نواب صاحب کو اس مرحلہ کے طے کرنے میں بعض قدیم تصنیفات سے مدد ملی ہے کیونکہ خود اسی خاندان کے مصنّفین نے انساب النوایط وغیرہ کے عنوان سے ایک دو کتابیں لکھی ہیں جو اس مرحلہ میں گویا چراغ راہ ہیں، لیکن نواب صاحب نے جس قسم کے واقعات اور حالات بہم پہنچائے ہیں ان کے لحاظ سے یہ تصنیف گویا اس باب میں پہلی تصنیف ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں مضامین کی جو فہرست ہے اس سے بہ آسانی اس دعویٰ کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ ”یہ ضرور ہے کہ ایسی تحقیقات کے بہم پہنچانے میں چونکہ ہر قسم کی تصنیفات کا اعتبار کرنا

پڑا ہے، اس لیے ایک نکتہ چیں کو اعتراض کا موقع ہاتھ آسکتا ہے مثلاً صفحہ ۲۹ میں محدث طبری کی جو عبارت نقل کی ہے وہ اصل کتاب نہیں بلکہ گلستان نسب اور آزاد بلگرامی کے حوالے سے ہے اصل کتاب آج چھپ گئی ہے اور اس میں اس عبارت کا ہم کو پتہ نہیں ملتا۔لیکن اس قسم کے امور میں ایک مصنف اوروں کی رائے کا پابند نہیں ہوسکتا، وہ کہہ سکتا ہے کہ جس شخص نے حوالہ دیا ہے وہ مثبت ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس نے طبری کی چودہ جلدوں میں سے کسی موقع پر یہ عبارت دیکھی ہو جب تک اتنی بڑی کتاب کا لفظ لفظ مطالعہ نہ کیا جائے ایک معتبر ناقل کے حوالہ کو غلط نہیں کہا جاسکتا''۔ خاکسار

شبلی نعمانی (شمس العلماء)

ناظم سررشتہ علوم وفنون، سرکار نظام و معتمد انجمن ترقی اردو

(خاتمہ کتاب ص:۵۷۹ تا ۵۸۲)

علاوہ ازیں ''تاریخ النوائط'' کے مصنف نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ انہوں نے ''تاریخ طبری'' دیکھی ہے اور اسی میں سے مذکورہ عبارت کو نقل کیا ہے جس پر بحث ہورہی ہے بلکہ مصنف موصوف نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں صراحتاً یہ اعتراف کیا ہے کہ ''ذیل میں ایک فہرست ان کتابوں کی لکھی جاتی ہے جس سے اس تالیف میں مدد ملی جس میں بعض ایسی کتابوں کے نام بھی درج کر لیے گئے ہیں جس کا اصل نسخہ مولف کو دستیاب نہ ہوسکا بلکہ کسی دوسری تصنیف سے اس کا پتہ چلا، جس حد تک ان تصانیف کی عبارت منقولی مل سکی اس کی نقل النقل اس کتاب کے خاتمہ میں لکھ دی گئی'' (دیباچہ ص ۵) نواب عزیز جنگ بہادر نے خاتمہ کتاب میں ضمیمہ نشان (۸) از تاریخ طبری مصنفہ ابوجعفر طبری منقول از'' گلستان نسب'' کے تحت مجوث عنہ عبارت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے ''حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ''سبحۃ المرجان'' میں اسی کا حوالہ دیا ہے اور مولوی باقر آگاہ قدس سرہ نے اپنی تصنیف ''نفحۃ العنبر یہ'' میں طبری کے قول سے بحث کی ہے'' (ص:۵۶۰) بات دراصل یہ ہے کہ قوم نوائط کی ہجرت مختلف زمانوں میں الگ الگ مقامات سے مختلف وجوہ کی بنا پر ہوتی رہی۔ چنانچہ ان کی پہلی ہجرت کا واقعہ حجاج بن یوسف کے دور تسلط میں پیش آیا اور یہ ہجرت مدینہ منورہ سے ہوئی تھی جہاں اس قوم کے افراد سکونت پذیر تھے۔ علاوہ ازیں ''تاریخ النوائط'' کے مصنف نے گلستان نسب کے بیان پر بحث کرتے ہوئے رقم کیا ہے ''جب اس قوم کا نسبی شجرہ تین شاخوں پر مشتمل ہے اور ان تینوں سلسلوں کی ہجرت دو مختلف زمانوں میں بروئے کتب معتبرہ ثابت ہے تو یہ بات آسانی کے ساتھ مانی جاسکتی ہے کہ شیخ علامہ (جلال الدین سیوطیؒ) نے

واقعہ ہجرت سلسلۂ ثالث کو خلیفۂ وقت کے مظالم سے مخصوص فرمایا ہے جس سے حجاج بن یوسف مراد نہیں ہے، اس لیے کہ وہ نہ کسی زمانے میں خلیفہ رہا ہے اور نہ ۱۵۲ھ اس کی حکومت کا زمانہ تھا''۔

آخر میں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ لفظ نائط کا املا طائے حطی اور تائے قرشت دونوں طرح درست ہے جس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مصنف تاریخ النوائط لکھتے ہیں ''مولف نے وجہ تسمیہ کے متعلق جس قدر تحقیق کی ہے اس سے دو نتیجے پیدا ہوئے ہیں۔(۱) یہ کہ اس قوم کا املا طائے حطی کے ساتھ موضع نایط اور دوسرے معنوں سے متعلق ہونے کے سوا نسب سے بھی تعلق رکھتا ہے، اس لیے کہ مولانا باقر آگاہؒ نے جد قبیلہ کا نام ''نایط بن نضر'' کہا ہے لیکن تائے قرشت کا املا متعلق بہ نسبت نہیں ہوسکتا یا تو اس کا بقول مصنف تاریخ فرشتہ ملیباری زبان سے تعلق ہے یا موضع ''نایت'' کی سکونت سے منسوب جیسا کہ ''لب اللباب'' اور ''تاج العروس'' سے موضع کا پتہ چلتا ہے، پس اس قوم کو اعتبارات مختلفہ کے لحاظ سے طائے مہملہ کے ساتھ نائطی کہنا بھی صحیح ہے اور تائے فوقانی کے ساتھ نائتی بھی''۔(باب دوم کی پہلی فصل، ص:۱/۲۸۔۲/۲۸)

حاصل کلام یہ کہ مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فاضل مراسلہ نگار نے جن امور کا ادعا کیا ہے اس سے دور ماضی کے اہل علم ناواقف و نابلد نہیں تھے۔ اب رہی تاریخ طبری کی عبارت کا معاملہ تو راقم کی رائے میں اس امر کا امکان ہے کہ گلستان نسب کے مولف کی نقل کردہ طویل عبارت میں درمیان میں ایک دو جملے چھوٹ گئے ہوں جس سے بظاہر تاریخی استحالہ نظر آرہا ہے۔ مخطوطات سے شغف رکھنے والے فاضلین بخوبی واقف ہیں کہ صدیوں پرانی ضخیم کتابوں کو نقل کرتے ہوئے کاتبوں سے حذف و اضافہ کی بے احتیاطی سرزد ہوجاتی ہے، جسے دور جدید کے محققین ایڈٹ کرتے وقت درست کرنے کی سعی کرتے ہیں، یہ عین ممکن ہے کہ مذکورہ مبحوث عنہ عبارت قدیم مخطوطے میں پائی گئی ہو اور بعد میں اس عبارت کو متن سے خارج کردیا گیا ہو۔

بہر حال راقم اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے عرض گذار ہے کہ ہم اپنی ہمہ دانی کے زعم میں بزرگان سلف پر بے جا انگشت نمائی کرنے سے پرہیز کریں تاکہ مخلصانہ علمی مباحثے کی راہ کھلی رہے۔

(جناب) راہی فدائی

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

مجلہ علوم اسلامیہ (علامہ شبلی نمبر): مدیر اعلیٰ پروفیسر سید حسن، مدیر پروفیسر ظفر الاسلام، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

علامہ شبلی کی وفات کے سو سال گزرنے پر ملک کے مختلف اداروں نے علامہ کی خدمات کے اعتراف اوران کے مقاصد کو پیش نظر رکھنے کی قابل قدر کوششیں کیں، ان اداروں میں جن کو خاص طور سے پیش پیش ہونا تھا ان میں مسلم یونیورسٹی کو بجا طور پر تفوق حاصل ہے، ہوا بھی یہی، وائس چانسلر جناب ضمیر الدین شاہ کے بقول علامہ شبلی کی ادبی بصیرت وذکاوت اور دانش ورانہ درک اور معلمانہ صلاحیت یقیناً نہایت بلند پایہ ہیں لیکن علی گڑھ تحریک کی تاریخ میں بھی وہ خاص مرتبہ کے حامل ہیں۔ یہی احساس تھا جس نے یونیورسٹی کے کئی شعبوں میں شبلی کی یادوں کی انجمن سجادی، مطالعات اسلامی کے شعبہ نے خراج تحسین کے لیے مجلہ علوم اسلامیہ کے ایک خاص شمارہ کو شبلی نمبر کی شکل میں پیش کرنے کی نیت کی۔ شعبہ کے معروف استاذ اور مشہور مصنف پروفیسر ظفر الاسلام جو ایک زمانہ سے شعبہ کی نیک نامی کا سبب رہے ہیں، سبک دوش ہوتے ہوتے انہوں نے اس باوقار شمارہ کو مرتب اور شائع کرکے خود ہی حسن تکمیل پر مہر لگادی۔ قریب گیارہ مقالات میں سات علی گڑھ ہی کے اصحاب فضل کے قلم سے ہیں جن میں علامہ مرحوم کی شخصیت کے امتیازی پہلو، دینی منزلت، قیام علی گڑھ، تعلیمی موقف، سرسید سے فکری تقابل، مستشرقین، اشعار عرب جیسے موضوعات پر عمدہ مطالعے اور تجزیے ہیں، باقی مضامین علامہ کے تصور تعلیم، ان کے ذوق خطابت، فارسی شاعری کے تعلق سے ہیں اور خوب ہیں، فاضل مدیر نے شبلی و علی گڑھ کے تعلق کو ایک نظر میں بڑے سلیقہ اور جامعیت سے پیش کردیا۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی کا مقالہ وہی ہے جو دارالمصنّفین کے صدی سمینار کا کلیدی خطبہ تھا اور جو معارف کے شبلی نمبر میں شائع ہوا لیکن اہمیت و افادیت خصوصاً سرسید کے علی گڑھ سے شبلی کے تعلقات کو اعتدال و توازن کی نظر سے دیکھنے کے لیے اس کا مطالعہ باربار کیا جانا چاہیے۔ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی نے علامہ شبلی کے دینی مرتبہ ومقام کے تعین کی خدمت انجام دی، حق یہی ہے کہ علامہ شبلی اول آخر عالم دین تھے اس لیے یہ کہنا برحق ہے کہ ”جب تک اردو اور اسلامیات باقی ہیں، مولانا شبلی کی دینی وجاہت بھی قائم رہے گی“۔ ایام علی گڑھ کی یادیں قدرتاً تفصیل سے ہیں جن میں خدا جانے

کتنے سوالوں کے تشفی بخش جواب آ گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ شبلی شمارہ شبلیات کے ذخیرہ میں عمدہ اور وقیع اضافہ ہے۔

نوائے ادب، علامہ شبلی خصوصی شمارہ: مدیر پروفیسر عبدالستار دلوی، قیمت: ۱۵۰/روپے،

پتہ: انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۹۲، دادا بھائی نوروجی روڈ، ممبئی۔

یہ شمارہ بھی گویا شبلی صدی تقریبات کا حصہ ہے، علامہ شبلی کی قلم رو میں بمبئی کا خطہ اتنا اہم ہے کہ خود شبلی اپنی ہر متاع کہنہ ونو کو اس پر نثار کرنے پر تیار تھے، انجمن اسلام ممبئی کا قدیم علمی و تہذیبی ادارہ ہے اور شبلی کے وجود کی برکت سے یہ بھی محروم نہیں رہا، انجمن کے موجودہ ذمہ داروں کا یہ احساس لائق ستائش ہے کہ انجمن سے رشتوں کی بنیاد پر شبلی کی یادوں کی شمع سے انجمن کو روشن کرنا علمی و تہذیبی فرض ہے چنانچہ نوائے ادب کے ذریعہ شعرالعجم اور پیروی مغرب، انجمن ترقی اردو، عربی زبان وادب، فارسی کلیات، شیخ اکرام، روشن خیالی، سیاست، شرر اور ذہنی ارتقا جیسے موضوعات کے تحت کئی بہترین تحریروں کا ایک گلدستہ پیش کر دیا گیا۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، آفتاب احمد صدیقی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے مضامین بھی ہیں جو قدیم ہونے کی نافعیت کا مظہر ہیں۔ اس طرح یہ شمارہ شبلی کے بارے میں قدیم وجدید خیالات ونظریات کا بھی آئینہ اور شفاف آئینہ بن گیا ہے۔

سہ روزہ دعوت، مسلم، غیر مسلم تعلقات، ماضی وحال کی روشنی میں مطلوبہ لائحہ عمل: مدیر جناب پرواز رحمانی، قیمت: ۵۵/روپے، پتہ: ڈی۔ ۱۴۳، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

ہندوستان کی موجودہ سیاسی فضا کی آلودگی میں یہاں کے تکثیری معاشروں کی بے احتیاطی یا بداحتیاطی کا بھی بڑا دخل ہے۔ اس ذہنی اور سماجی آلودگی کو دور کرنا اور فضا کو صاف وشفاف کرنا غالباً اس وقت ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اخبار دعوت ایسے مسائل پر غور کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے خصوصی شمارے شائع کرنے کا فریضہ انجام دیتا رہتا ہے۔ یہ شمارہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں اکثریت اور اقلیت یعنی ہندو مسلم باہمی تعلقات کو بہتر بنانے اور خصوصاً مسلمانوں کی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی باتیں کی گئی ہیں، اسلامی تعلیمات اس باب میں کیا ہیں اور ماضی میں مسلمانوں کا رویہ اور معاملہ کیا رہا ہے۔ ان سوالوں کو سامنے رکھا گیا ہے، باتیں بہت ہیں لیکن بجا طور پر کہا گیا کہ پہلا کام یہ ہے کہ مسلمان اپنی صفیں درست کر لیں اور اپنے اعمال کو کتاب وسنت کے مطابق ڈھال لیں۔

خاص شمارے اور بھی ہیں جیسے ادراک گوپال پور کا فصیح الدین بلخی نمبر، گلشن نعمانی مالیگاؤں کا مسلم پرسنل لا نمبر، انجمن خوش دلان کرناٹک بنگلور کا سہ ماہی طنز ومزاح، ہماری زبان کا پروفیسر حنیف نقوی نمبر، صفحات کی تنگ دامانی یا اور کالموں کی قامت کی درازی کے شکوہ کے ساتھ تاخیر کی معذرت بہرحال ضروری ہے۔

ع۔ ص

ادبیات

نعت

جناب وارث ریاضی ٭

حامل قرآں ، شہہِ ابرارؐ کی باتیں کرو
سرور کونینؐ کے کردار کی باتیں کرو

ان کے اخلاق حمیدہ کی کرو شرح جمیل
حسن اخلاص و وفا ، ایثار کی باتیں کرو

بانیِ عدل و ترحم ، داعیِ امن و اماں
پیکر انصاف کی سرکار کی باتیں کرو

جس نے دنیا کو عطا کی ہے خدا کی آ گہی
اس نبیِؐ صادق الاخبار کی باتیں کرو

جس کی تعلیم نبوت میں ہے دنیا کی فلاح
اس مجسم علم کے افکار کی باتیں کرو

نازش اہل زباں ہے جن کا انداز بیاں
ان کی شیریں، دل نشیں گفتار کی باتیں کرو

جس کی نکہت سے معطر ہے مشام کائنات
دوستو! اس روضۂ انوار کی باتیں کرو

دل کی آنکھوں میں بسا کر جلوۂ حسن حبیبؐ
کاکلِ مشکیں ، رخ گل نار کی باتیں کرو

جو دیار قدس ہے صد رشک فردوس بریں
اس دیار قدس کے دیدار کی باتیں کرو

جس کے ذکر خیر سے ملتا ہے اے وارث سکوں
روز و شب اس سیدؐ اخیار کی باتیں کرو

نعت شریف

جناب جمیل مانوی ٭٭

جلوہ فرما، نورحق ، جو تیری پیشانی میں ہے
اس سے بڑھ کر کون سی شے تاج سلطانی میں ہے

قیصری میں نہ ممکن شان کیوانی میں ہے
دو جہاں کی کامیابی تیری دربانی میں ہے

٭ کاشانہ ادب، سکٹا (دیوراج)، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن بہار ۸۴۵۴۵۳۔

٭٭ سہارن پور۔

اللہ اللہ کیسی عظمت حرف قرآنی میں ہے سرنگوں تھی کل بھی دنیا، اب بھی حیرانی میں ہے
لات وعزیٰ کے صنم خانے اجڑ کر رہ گئے تیری مشعل نور افشاں بزم امکانی میں ہے
جو شب ہجرت بجھانے آئے تھے حق کا چراغ یہ نہ سمجھے، حق ہے اور حق کی نگہبانی میں ہے
آدمیت پر تیری حکمت سے یہ روشن ہوا عظمت آدم خرد کی پاکدامانی میں ہے
عصر حاضر سے ترا نقش قدم کیا چھٹ گیا منزلیں گم ، کاروان فکر حیرانی میں ہے
جس نے شاہوں کو غلاموں سے کیا شیر وشکر وہ ادائے فقر آقا تیری سلطانی میں ہے

نعت

جناب رئیس احمد نعمانی

لازم ہے بڑھے فکر نہ آداب کی حد سے افزوں ہیں کمالات نبیؐ حد خرد سے
کرتی ہے بیاں، انؐ کے شہیدوں کی فضیلت آتی ہے ہوا جو طرف بدر و احد سے
محشر میں نہ کام آئے گا ہرگز کوئی طومار بنتی ہے وہاں بات فقط انؐ کی سند سے
توحید و رسالت ہیں مسلماں کی وراثت کچھ فائدہ ہرگز نہیں مدح اَب و جَد سے
آقاؐ کی ہدایت پہ عمل جو نہیں کرتا ممکن نہیں بچ جائے وہ شیطان کی زد سے
ہیں حد سے سوا آپؐ کے اوصاف وکمالات اے شاعرو! آگے تو بڑھو گیسو و خد سے
ہے ان کی غلامی سے جہاں میں مری عزت جلتے رہے بدبخت جو جلتے ہیں حسد سے
میں کیا ہوں رئیسؔ اور مرے فکر و قلم کیا
نعت نبیؐ لکھتا ہوں بس اللہ کی مدد سے

گوشۂ مطالعات فارسی، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱۔

مطبوعات جدیدہ

ایودھیا کا تنازعہ، رام جنم بھومی، فسانہ ہے حقیقت نہیں

از جناب محمد عبدالرحیم قریشی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۷۶، قیمت: ۲۵۰/روپے، پتہ: دفتر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ۷۶/۱۷/۱، مین مارکیٹ، اوکھلا ویلیج، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۔

بابری مسجد کے قضیہ پر کئی کتابیں آچکی ہیں، عموماً مسلمان مصنّفین نے اس کے تاریخی پس منظر کو مستند کتابوں کے حوالوں سے بڑے تحقیقی انداز میں پیش کر کے اس پورے مسئلہ کے مالہ وما علیہ کو بیان کردیا، دارالمصنّفین سے شائع ہونے والی کتاب ان میں سرفہرست ہے جس کو جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے غیر معمولی محنت وجستجو سے اس وقت تیار کیا تھا جب یہ مسئلہ شباب پر تھا، لیکن شاید اردو میں شائع ہونے والی ان کتابوں سے ملک نے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی کی اور نتیجہ بالآخر بابری مسجد کی شہادت تک جا پہنچا۔حق، انصاف اور قانون سب ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے۔گو ملک کے انصاف پسند شہریوں نے اس ظالمانہ فعل پر نکیر بھی کی، ملک کے مقتدر اخبارات نے اس کو قوم کے لیے باعث شرم، قومی دھوکہ دہی، ایودھیا میں حقوق کی پامالی، جمہوریت کے نام پر داغ جیسے عنوانوں سے تعبیر کیا، لیکن ایک شرپسند طبقہ کی مفاد پرست سیاست سب پر غالب رہی، اب یہ قضیہ نامرضیہ ہر بڑے حادثہ کی طرح محض ایک تکلیف دہ یاد بن کر رہ گیا ہے۔لیکن حق وانصاف کے حصول کے لیے اور تنگ ذہنوں کی کشادگی کے لیے راہیں بہرحال بند نہیں ہیں۔زیر نظر کتاب اسی یقین کا نتیجہ ہے، فاضل مصنف مسلم پرسنل لا بورڈ کے اہم رکن ہیں، باوقار قانون داں ہیں اور سب سے بڑھ کر حق کو حق کی نظر سے دیکھنے والے ہیں۔انہوں نے ایک بار پھر برادران وطن کو اس کتاب کے ذریعہ ایک پیغام دیا ہے کہ وہ اس عظیم ملک کو غارت گروں سے محفوظ رکھنے میں عدل وانصاف سے تعاون کریں، انہوں نے بڑے مدلل انداز میں ان حقائق کو دہرایا ہے جن کی روشنی میں یہ ثابت ہے کہ موجودہ ایودھیا، شری رام چندر کی ایودھیا نہیں اور بابری مسجد کسی مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی۔کتاب کے سرورق

سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے لیکن اندرون کتاب ایک عبارت سے ظاہر ہے کہ یہ دراصل انگریزی میں "ایودھیا اپی سوڈ" کے نام سے لکھی گئی تھی۔ مترجم غالباً خود مصنف ہی ہیں کیونکہ زبان و اسلوب سے حیدرآبادی اثرات ظاہر ہیں۔ شروع کے تین ابواب ایودھیا، رام، رامائن، آثار قدیمہ اور بابری مسجد کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ دارالمصنّفین کی بابری مسجد میں یہ قدرے تفصیل سے ہیں لیکن باقی ابواب جو تاریک ترین دن، رام مندر، خونیں شاخسانہ، نرسمہا راؤ کا رول اور موجودہ ایودھیا اور بابری مسجد کے عنوان سے ہیں، یہ نہایت اہم ہیں اور ان کے مباحث نے اس کتاب کو دیگر کتابوں سے ممتاز بنادیا ہے۔ مثلاً تاریک ترین دن والے باب میں انہدام کے اگلے روز بڑے انگریزی اخباروں جیسے دی ہندو، ٹائمز آف انڈیا اور دکن کرانیکل نے جو کچھ لکھا اس کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ گواہیاں ہیں جو کبھی نہ کبھی اپنا اثر ضرور دکھائیں گی، وقت کے غبار میں چھپ جانے کا اندیشہ بھی اس کتاب سے دور ہوگیا، خدا جانے اس کے انگریزی ایڈیشن کا کیا اثر ہوا لیکن یہ ضرور ہے کہ غیر اردو داں طبقہ کے ضمیر کو جھنجھوڑنے میں یہ یادداشتیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوں گی۔ ایک دلچسپ رام مندر قانون اور ہندو دھرم کے خلاف ڈاکٹر سبرامنیم سوامی کا مفصل تبصرہ ہے۔ آج موصوف اپنی زندگی کے اس مرحلے میں ہیں جہاں شاید ان کی یہ باتیں خود ان ہی کے لیے اجنبی اور نامانوس ہوں، آج وہ اقتدار کی چاہت میں جہاں ہیں وہاں شاید ان کو اس پستی کا احساس نہ ہو لیکن اس کتاب کے ذریعہ ان کو اپنے ہی کہے ہوئے یہ الفاظ ضرور کچوکے لگائیں گے کہ "راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ دیوانگی کا نمونہ ہے، وہ موافق ہندو تنظیم نہیں ہے، خالصتاً مسلم دشمن تنظیم ہے۔ وہ ایودھیا کی بات تو کرتے ہیں لیکن کیلاش مان سرور کی بات کیوں نہیں کرتے جو آج کل چینیوں کے قبضہ میں ہے"۔ آج یہی سوامی جی آر ایس ایس کی کاسہ لیسی میں مصروف ہیں، یہ پورا باب بڑا چشم کشا ہے کہ محض اقتدار کے حصول کے لیے لوگ کیا سے کیا ہوجاتے ہیں۔ ایسے میں اگر تاریخ ہی کو مسخ کرنے کی سازش کی جائے تو حیرت کیا۔ اس نہایت مفید کتاب پر مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے مقدمہ میں لکھا کہ یہ کتاب تاریخی و تحقیقی لحاظ سے ایک دستاویز کی حامل ہے۔ اس سے اس مسئلہ کو سمجھنے میں پوری مدد ملے گی۔

ع۔ص

رسید موصولہ کتب

(۱) **الهداية القرآنيه سفينه نجاة للانسانية**: الشیخ محمد الرابع الحسنی الندوی، تعریب محمد فرمان الندوی، ناشر: المجمع الاسلامی العلمی، پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں

(۲) **بیاض رحمت**: مولوی رحمت علی رحمت، مرتبہ خاور نقیب، پتہ: کامران پبلی کیشنز، رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک، اڑیسہ۔ قیمت=/۱۵۰ روپے

(۳) **تصوف اور شریعت (جلد اول)**: ڈاکٹر عبدالحق انصاری ترجمہ مفتی محمد مشتاق تجاروی، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

قیمت=/۱۲۰ روپے

(۴) **تلاش فکر وفن**: ڈاکٹر حدیث انصاری، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔ قیمت=/۳۰۰ روپے

(۵) **تنسيق النظام فی مسند الامام ابی حنيفه**: علامہ محمد حسن سنبھلی، تحقیق ڈاکٹر ولی الدین تقی الدین ندوی، پتہ: الریان انسٹی ٹیوشن پبلشرز، بیروت، لبنان ۔ قیمت درج نہیں

(۶) **قرآنیات وادبیات**: پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، پتہ: شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ قیمت=/۳۵۰ روپے

(۷) **كتاب الزهد الكبير للبيهقي**: تحقیق وتعلیق مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی، پتہ: اروقہ للدراسات والنشر، پوسٹ بکس ۱۹۱۶۳، عمان ۱۱۱۹۶، اردن۔ قیمت درج نہیں

(۸) **کتابوں کے درمیان**: ریاض الرحمٰن خاں شروانی، مرتب ڈاکٹر ابوذر متین، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ قیمت=/۵۰۰ روپے

(۹) **منهج العلامتين شبلي النعماني و سليمان الندوی فی كتابهما سيرة النبیؐ**: مولانا فریدالدین ندوی، اروقہ للدراسات والنشر، عمان، اردن۔ قیمت درج نہیں

(۱۰) **مولانا حمیدالدین فراہی کے بنیادی افکار**: جناب الطاف احمد اعظمی، پتہ: ۱۱۰۔ اے اپارٹمنٹ، البلاغ پبلی کیشنز، N-1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ قیمت=/۱۵۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	100/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعرالعجم اول	150/-
شعرالعجم دوم	130/-
شعرالعجم سوم	125/-
شعرالعجم چہارم	150/-
شعرالعجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	230/-
علم الکلام	180/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	100/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	85/-
سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	180/-
کلیات شبلی (فارسی)	45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)	100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
شذرات شبلی مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-

ISSN 0974 - 7346 MA'ARIF (URDU) -PRINT
DEC 2015 Vol- 196 (6)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016
Monthly Journal of
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org Fax No: 05462 - 265080
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
(Office Mobile) 07607046300 / 09170060782